رابطہ ادب اسلامی (عالمی) کا ترجمان

سہ ماہی

# کاروانِ ادب

بانی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

# سہ ماہی کاروانِ ادب اسلامی


## مجلس مشاورت

پروفیسر عبداللہ عباس ندوی، مکہ مکرمہ
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ
مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب
ڈاکٹر محمود الحسن عارف
مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ
پروفیسر ظہور احمد اظہر
مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

## مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

### مجلس ادارت

پروفیسر محمد اجتباء ندوی، دہلی
پروفیسر محسن عثمانی ندوی، C.I.E.F.L. حیدرآباد
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، اے، ایم، یو، علی گڑھ
مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ
ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ

### معاون انتظامی

اقبال احمد ندوی

### معاون طباعت

انیس احمد ندوی



طباعت:- پاریکھ آفسٹ، لکھنؤ

کمپوزنگ:- حامد خوشنویس-لکھنؤ


## زرتعاون

| | |
|---|---|
| اس شمارہ کی قیمت | -/۴۰ روپے |
| سالانہ برائے ہندوستان | ایک سو پچاس روپے |
| پاکستان و بنگلہ دیش | تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر |
| ان کے علاوہ دیگر ممالک | چار سو روپے یا بارہ امریکی ڈالر |

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں..... RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)


صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

# فہرست مضامین


| جلد نمبر ۱۱ | اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء | شمارہ نمبر ۳ |
|---|---|---|



| عناوین | | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| منزل بہ منزل | مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی | ۳ |

## مقالات

| | | |
|---|---|---|
| علامہ اقبال کی تربیتی نظمیں | محمد بدیع الزماں | ۸ |
| مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی | نفیس احمد خاں ندوی | ۲۲ |

## شعروادب

## (قندمکرر)

| | | |
|---|---|---|
| خطاب بہ جوانان اسلام | (نظم) علامہ اقبال | ۲۷ |
| ”جسے جینا ہو، مرنے کے لئے تیار ہو جائے“ | (غزل) جگر مرادآبادی | ۲۸ |
| خاکِ پائے سید والا گہر ہو جایئے | (غزل) ابوالمجاہد زاہد | ۲۹ |

# منتخب مقالات مذاکرۂ علمی (۲۰)

## اردو شاعری میں ملی احساسات کی ترجمانی

### منعقدہ دارعرفات، رائے بریلی بتاریخ ۴ رمئی ۲۰۰۳ء


| | | |
|---|---|---|
| مسدس حالی کی ایک جھلک | ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی | ۳۰ |
| علامہ شبلی نعمانی کی شاعری میں ملی احساسات کی ترجمانی | مولانا انوار عالم ندوی | ۴۵ |
| علامہ اقبال کی شاعری اور غیرت ملی وحمیت دینی | مولانا عبدالسبحان ندوی | ۵۶ |
| شاعر انقلاب علامہ اقبال اور نئی نسل | مولانا عبدالرشید ندوی | ۷۳ |
| علامہ اقبال کی شاعری میں ملی احساسات کی ترجمانی | مولانا عبدالغفار ندوی | ۸۳ |
| مثنوی گلزار ابراہیم | مولانا معاذ احمد کاندھلوی | ۹۴ |
| سید عبدالرزاق کلامی اور مثنوی صمصام الاسلام | مولانا رحمت اللہ نیپالی | ۱۰۶ |
| تذکرہ نگاری میں مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کا حصہ | محمد فرمان نیپالی | |
| ''گل رعنا'' کے آئینہ میں | | ۱۱۶ |
| اسلامی ادب کے علم بردار مولانا سید احمد عروج قادری | محمد ثناء الہدیٰ قاسمی | ۱۲۸ |

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

# منزل بہ منزل

اردو زبان کے آغاز اور رواج سے قبل ملک میں اہل علم اور اہل اقتدار کی اختیار کردہ زبان فارسی تھی، کتابیں بھی اسی زبان میں لکھی جاتی تھیں، اور سرکاری ہدایات اور خط و کتابت بھی فارسی میں ہوتی تھی، لیکن عامۃ الناس کی زبان، جو اہل علم نہ تھے اور ملک میں اکثریت بھی ان ہی کی تھی، عوامی زبان تھی جو شمالی ہند میں ہندی کی ہی ایک شکل تھی، عوام کو مخاطب کرنے اور ان سے ربط کے لئے اس عوامی زبان کی ضرورت پڑتی تھی، وعظ و نصیحت اور عوامی ربط کے لئے ضرورت دونوں زبانوں کے درمیان واسطہ کی ایک زبان کی تھی، جو اردو کے ذریعہ پوری کی گئی، اردو کا لفظ ترکی میں فوج کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس واسطہ کی زبان کی اصل ضرورت فوج میں جو کہ عوام کے مختلف طبقات پر مشتمل ہوا کرتی ہے، استعمال کی ہوئی ہوگی، ایسی زبان کا استعمال جو عوام میں استعمال کی جائے تحریری طور پر اور باوقار انداز میں استعمال کرنے کا کام دراصل اس وقت کے اہل علم اور اہل دین کو اختیار کرنا پڑا، اس طرح اردو زبان تحریری طور پر اور ادبی دائرہ میں اہل علم و ادب کے ذریعہ رواج پذیر ہوئی، ان اہل علم میں واعظین اور صوفیاء بھی تھے اور ادب و فن کا ذوق رکھنے والے افراد بھی تھے، لہذا اردو کی تشکیل کے وقت ہی سے اہل ذوق کے ذریعہ اردو ادب کا بھی

آغاز ہوگیا، اور شاعری بھی ہونے لگی۔

یہ اہل ذوق واہل علم عموماً اعلیٰ اقدار کے حامل ہوتے تھے، اس طرح ان کے ادب وشاعری کا ارتباط انسانی واخلاقی اقدار سے بھی ہوتا تھا، جس کی جھلک نمایاں طور پر ان کے کلام میں ملتی ہے، چنانچہ بتدریج اردو شاعری ملی ضرورت کے تقاضہ سے ملی خیالات کی بھی ترجمانی کرنے لگی جو برطانوی سامراج کی چیرہ دستیوں اور عالم اسلامی میں مغربی استعمار کے ذریعہ لائے جانے والے تغیرات کے تذکرہ پر بھی مشتمل ہوتا تھا۔

ہم کو انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوکر بیسویں صدی کے اختتام تک جو اردو شاعری ملتی ہے، اس میں ملی احساسات کی ترجمانی کا خاصا حصہ ملتا ہے، اردو شاعری کے اس حصہ نے اپنے زمانہ کے نوجوانوں کے ذہنوں اور ان کے احساسات کی تشکیل میں اچھا کردار انجام دیا، اور ذہنوں میں ملت اسلامیہ کی ضرورتوں اور تقاضوں کی اہمیت بٹھائی، اس طریقہ سے اردو شاعری نے ملت اسلامیہ کی اچھی خدمت انجام دی۔

اردو شاعری کا یہ حصہ ہمارے سابقہ فکری وادبی سرمایہ کا قیمتی جز ہے، ضرورت ہے کہ اس کو نئی نسل کے قارئین کے سامنے لایا جائے اور اس سے کسب فیض کیا جائے، ادب وشاعری کا انسانی ذہن وقلب پر جو اثر پڑتا ہے وہ سرسری نظر سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے، اس کی جو اثر پذیری اور افادیت ہے اس کو اس کا پورا حق ملنا چاہئے۔

ملی جذبات واحساسات اور اعلیٰ ملی اقدار کی ترجمانی کرنے والے اہل ادب میں خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، جسٹس اکبر حسین، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حفیظ جالندھری جیسے کاملین شعر وادب نے اپنے فکر

وفن سے ملت کی جو خدمت اور اس کے اعلیٰ اقدار کی جو وکالت کی، اور اپنے عہد کے فرزندان ملت کے ذہن وقلب کو جو عطیہ دیا اس کی طاقت وتاثیر تا حال باقی ہے، ضرورت ہے کہ اس کی طرف اور اس جیسے دوسروں کے ادب کی طرف توجہ کی جائے اور فرزندان ملت کو اس سے روشناس کرایا جائے۔

اس سلسلہ میں ہمارے رابطہ ادب اسلامی نے رائے بریلی میں ادارہ دار عرفات کی دعوت پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا، اس میں جو مضامین پیش کئے گئے ان کا ایک انتخاب اس تازہ شمارہ میں دیا جارہا ہے، امید ہے کہ ہمارے قارئین اس کو مفید محسوس کریں گے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین۔

محمد بدیع الزماں
ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ
ہارون نگر، پھلواری شریف۔ پٹنہ

# بچوں کے لئے اقبال کی تربیتی نظمیں

اقبال نے اگر جوانوں اور بڑے بوڑھوں کے دلوں میں اپنے کلام سے ساری زندگی ایمان ویقین کی شمع روشن کی تو ننھے منّے بچّے بھی اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں رہے۔ بلکہ اگر اقبال کی شاعری کے مختلف دور کا تجزیہ کیا جائے تو بہت ہی اوائل شاعری میں، جس کی مدّت اقبال نے خود "بانگِ درا" میں ۱۹۰۵ء تک ترتیب دی ہے اُنہوں نے ہلکی پھلکی نظموں کے علاوہ بہت سی نظمیں خصوصی طور پر بچوں کے لئے لکھی۔ اِن نظموں میں اقبال نے بچوں کو اخلاقیات کے بہت بڑے بڑے اور سبق آموز درس دئے، اس لئے کہ اخلاقیات ایمانیات ہی کا جزو ہیں۔ اُنہوں نے ان نظموں کے لئے موضوعات بھی ایسا انتخاب کیا جو زندگی کے ہر دور اور ہر مرحلہ میں یکساں اہمیت اور افادیّت کے حامل ہیں۔

۱۹۰۵ء کی اہمیت اقبال کی زندگی میں یہ ہے کہ وہ اس سال تک لاہور کے مقامی کالج کے طالبِ علم رہے اور کچھ مدّت کے لئے اسی کالج میں لکچرر بھی اور اسی ۱۹۰۵ء میں وہ بہ سلسلہ اعلیٰ تعلیم یورپ چلے گئے جہاں اُن کا قیام ۱۹۰۸ء تک رہا۔ اس لئے اُن کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ہے۔ اور دوسرے دور

میں وہ اقبال ہم لوگوں کے سامنے آئے جس اقبال کو ہم علامہ اور حکیم الامت کے لقب سے نوازتے ہیں۔ بچوں کے لئے نظمیں صرف "بانگِ درا" کے اسی دورِ اوّل میں ہی ہیں۔

"بانگِ درا" میں بچوں کے متعلق پہلی نظم "عہدِ طفلی" ہے جس میں اُنہوں نے چھوٹے بچوں کی نفسیاتی زندگی کی تصویر کھینچی ہے، جس سے اُن کی قوتِ مشاہدہ کا ثبوت مل سکتا ہے، اس نظم سے پہلے ہی سفر میں اقبال نے بچّے کو ماں کی گود کی اہمیت یاد دلائی ہے جس کی وسعت اور فضیلت لفظی معنوں میں بیان نہیں کئے جاسکتے ہیں۔

تھے دیارِ زمین و آسماں میرے لئے
وسعتِ آغوشِ مادر اِک جہاں میرے لئے

بچوں کی نفسیاتی زندگی پر شورشِ زنجیرِ در سے اُن کے لطف اندوز ہونے کو عہدِ طفلی کی نادانی پر محمول کرتے ہوئے اقبال اس کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

دورِ طفلی میں اگر کوئی رُلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے

ماں کی گود میں بچے بہت سے سوالات کرتے ہیں اور مائیں جو اُن کا جواب دیتی ہیں وہ جب بچوں میں سمجھ آتی ہے تو اُس وقت وہ جوابات دروغِ مصلحت آمیز معلوم ہوتے ہیں یعنی ایسا جھوٹ جو کسی مصلحت کے لئے بچّے کو خاموش کے لئے بولا گیا تھا۔

پوچھنا رہ رہ کے اُس کوہ و صحرا کی خبر
اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر

اقبال نے "دروغِ مصلحت آمیز" کی ترکیب "گلستاں" کے اس مشہور مقولہ

سے اخذ کی ہے: ''دروغِ مصلحت آمیز، بہ از راستیِ فتنہ انگیز''

تربیتی نظموں میں ''بانگِ درا'' میں بچوں کے لئے خصوصی طور پر لکھی گئی پہلی نظم ''ایک مکڑا اور مکھی'' ہے یہ نظم مکڑا اور مکھی کے مابین مکالمہ کے طور پر ہے۔ مکڑے کو مکھی کو اپنے جال میں پھسانا تھا تاکہ اُسے خوراک مل جائے۔ اُسے پھسانے کے لئے مکڑا پہلے اپنے گھر کی تعریف یوں کرتا ہے۔

لٹکتے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے
ہر شخص کو ساماں یہ میسّر نہیں ہوتا

مکھی پھر بھی مکڑے کی باتوں میں نہ آئی اور انکار ہی کرتی چلی گئی۔ جب مکھی کسی طرح مکڑے کے جال میں پھنسنے کو تیار نہ ہوئی تب مکڑے نے کہا۔

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندہ

اب مکڑا خوشامد پر اُتر آیا اور مکھی کی خوبصورتی کی تعریف شروع کی۔ کہنے لگا:

ہوتی ہے اُسے آپ کی صورت سے محبت
ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
یہ حُسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اُڑتے ہوئے گانا

جب مکھی نے مکڑے کی یہ خوشامدانہ باتیں سُنی تو اس کا دل پسیج گیا اور کہنے لگی۔

انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں بُرا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا

اب اقبال اس نظم کو یہ کہہ کر اختتام کو پہنچاتے ہیں جو اس نظم کا ماحصل ہے:

یہ بات کہی اور اُڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو مکڑے نے اُچھل کر اُسے پکڑا
بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اُڑایا

اس نظم میں اقبال نے بچوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ دشمن کی چکنی چپڑی باتوں میں ہرگز نہ آنا چاہئے۔

''بانگِ درا'' میں بچوں کے لئے دوسری تربیتی نظم ''ایک پہاڑ اور گلہری'' ہے جس میں اقبال نے بچّوں کو یہ نسخہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نہ نکمّی ہے نہ بُری۔ ہر چیز اُس کارخانۂ قدرت میں اپنی اپنی جگہ اتنی ہی اہم ہے اور ان کی الگ الگ اہمیت کے پیشِ نظر ہی قدرت اُنہیں وجود میں لائی ہے۔ یہ نظم بھی پہاڑ اور گلہری کے مکالمہ کے طور پر ہے۔

پہاڑ اپنے کو دنیا میں سب سے بڑی چیز سمجھتا تھا، اسکی اونچائی، لمبائی اور اس کا پھیلاؤ ضرور ہیبت ناک اور عظیم ہے، کہاں یہ دیو قامت چیز اور کہاں حقیر سی ایک گلہری، چنانچہ پہاڑ اپنے غرور میں گلہری کو بہت کچھ بُرا بھلا سنانے لگا۔ کہنے لگا:

ذرا سی چیز ہے، اس پر غرور! کیا کہنا!
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور! کیا کہنا!

خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں ، جانور غریب کہاں

گلہری کو پہاڑ کی یہ باتیں بہت بُری لگیں اور اُس نے پہاڑ کو کھری کھوٹی سُنانی شروع کی۔ کہنے لگی:

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اُس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے
قدم اُٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
بڑی بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

اور آخر میں اقبال نے اس نظم کا لب لباب گلہری کی زبان پر یہ رکھا ہے جو وہ بچوں کو ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں۔

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

''''بانگ درا'''' میں بچّوں کے لئے لکھی گئی تیسری تربیتی نظم ''ایک گائے اور بکری'' ہے، یہ نظم بھی گائے اور بکری کے درمیان مکالمہ کے طور پر ہے، اس نظم کی شروعات اقبال نے منظر نگاری سے کی ہے۔ اقبال نے اپنے سارے کلام میں زیادہ تر ایمان ویقین، اخلاق اور تربیت کی باتوں کو ذہن نشیں کرانے کے لئے ان نکتوں کو مکالموں میں پیش کیا ہے اور قبل پیش کرنے کے مناظرِ فطرت کا سہارا لیا ہے جو اُس نظم کو زیادہ دلفریب بنا دیتا ہے، اس نظم میں گائے اور بکری کی مناسبت سے نظم چراگاہ سے شروع ہوتی ہے، چراگاہ کا منظر نامہ کتنے ہلکے پُھلکے الفاظ میں جو بچّوں کی سمجھ میں آسکے اقبال نے یوں پیش کیا ہے:۔

اِک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت
اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
طائروں کی صدائیں آتی تھیں

اس کے بعد کچھ آدابِ ملاقات اقبال نے یوں بچّوں کو ذہن نشیں کرایا ہے:

کسی ندی کے پاس ایک بکری
چرتے چرتے کہیں سے آنکلی
جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا
پاس اک گائے کو کھڑے پایا
پہلے جُھک کر اسے سلام کیا
پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں
گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں

اس کے بعد گائے اپنے دُکھ درد کو بیان کرنے لگی، کہنے لگی:

کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی
ہے مصیبت میں زندگی اپنی
جان پر آبنی ہے، کیا کہئے
اپنی قسمت بُری ہے، کیا کہئے
دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں
رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں
زور چلتا نہیں غریبوں کا
پیش آیا لکھا نصیبوں کا
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے
اس سے پالا پڑے، خدا نہ کرے

اس کے بعد اقبال نے گائے پالنے والی کی نفسیات گائے کی زبان پر رکھی ہے:

دودھ کم دوں تو بُڑ بُڑاتا ہے
ہوں جو دُبلی، تو بیچ کھاتا ہے
ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے
کن فریبوں سے رام کرتا ہے
اُس کے بچّے کو پالتی ہوں میں
دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
بدلے نیکی کے یہ بُرائی ہے
میرے اللہ! تری دُہائی ہے

گائے کی یہ سب باتیں بکری کو بھلی نہیں لگیں اور کہا کہ ''ایسا گلہ نہیں اچھا''۔ اس لئے کہ چراگاہ کی یہ ساری رونق تو آدمی ہی کی محنت اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔اسی نکتہ کو بکری گائے کو یوں ذہن نشیں کراتی ہے:

بات سچی ہے بے مزا لگتی
میں کہوں گی مگر خدا لگتی
یہ چراگاہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں
یہ کہاں، بے زباں غریب کہاں
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں
لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی

قید ہم کو بھلی، کہ آزادی؟
سوطرح کا بنوں میں ہے کھٹکا
واں کی گزر ان سے بچائے خدا
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا
ہم کو زیبا نہیں جگہ اس کا
قدر آرام کی اگر سمجھو
آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو

بکری کی نصیحت کا گائے پر اچھا اثر پڑا۔ چنانچہ:

گائے سن کر یہ بات شرمائی
آدمی کے گلے سے پچتائی
دل میں پرکھا بھلا برا اس نے
اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی!

اس آخری شعر میں اقبال بچوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اگر کوئی چھوٹا آدمی بھی عقل کی بات کہے اور اچھی باتوں کا سبق دے تو بڑے کو اس کی بات ماننی چاہئے اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم بڑے ہیں اس لئے عقل صرف ہمارے حصہ میں آئی ہے۔

""بانگ درا" میں بچوں کے لئے چوتھی تربیتی نظم "بچے کی دعا" ہے جو نظم کہ کافی مشہور ہے۔

چونکہ اردو شاعری میں بچوں کے لئے اتنی نصیحت آموز اور بصیرت افروز دعا

نہیں لکھی گئی اس لئے اسے پورا نقل کیا جا رہا ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

''''بانگ درا'''' میں بچوں کے لئے پانچویں تربیتی نظم ''ہمدردی'' ہے جس میں اقبال نے بچوں کو ہمدردی کا سبق دیا ہے اور یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ اچھے ہیں جو ازراہ ہمدردی وقت پر دوسروں کے کام آتے ہیں۔ یہ نظم بھی بلبل اور جگنو کے درمیان مکالمہ کے طور پر ہے۔ الفاظ بہت ہلکے پھلکے مگر انتہائی سبق آموز ہیں۔

رات سر پر آگئی تھی، اندھیرا ہو گیا تھا اور چونکہ بلبل اپنے آشیاں تک نہیں پہنچ سکا اس لئے ایک درخت کی ٹہنی پر اداس بیٹھا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب

جب ہر چیز پر اندھیرا چھا گیا ہے تو میں اپنے آشیاں تک کیسے پہنچوں۔
بلبل کی یہ آہ وزاری سن کر ایک جگنو نے جو پاس ہی میں تھا بلبل سے بولا:

حاضر ہوں مدد کو جان ودل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

''بانگ درا'' میں بچوں کے لئے چھوٹی تربیتی نظم ''ماں کا خواب'' ہے۔اس نظم میں ماں نے یہ خواب دیکھا کہ بہت سے لڑکے زرق برق پوشاک پہنے ہاتھ میں دیا لئے کہیں جارہے ہیں اور اس جماعت میں اس کا لڑکا بھی ہے مگر وہ پیچھے ہے اور وہ نہ چلتا تھا اور نہ اس کے ہاتھ کا دیا جلتا تھا۔ماں نے اسے پہچان لیا اور بچے کو مخاطب کر کے کہنے لگی:

جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ ،اچھی وفا تم نے کی

بچے نے ماں کی یہ بات سن کر منہ پھیر کر جواب دیا:

رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا
دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے!

''بانگ درا'' میں بچوں کے لئے ساتویں اور آخری تربیتی نظم ''پرندے کی فریاد'' ہے۔ ایسے تو بظاہر یہ نظم ایک پرندے کا قفس میں قید ہونے کی وجہ سے اس کے درد دل کی آواز ہے مگر یہ نظم اس وقت لکھی گئی جب ہندوستان انگریزوں کا غلام تھا۔ اقبال کے ذہن میں انگریزوں کی یہی غلامی تھی جس سے چھٹکارا پانے کے لئے انہوں نے پرندے کو بطور علامت استعمال کر بچوں کو صفر سنی ہی میں غلامی کی مکروہات کے نکتہ کو ذہن نشین کرایا۔ دوسری بات جو اقبال نے اس نظم میں ذہن نشین کرائی ہے وہ یہ کہ قفس میں انسان اسی کو ڈالتا ہے یعنی کسی کی آزادی اسی وقت چھینتا ہے جب وہ اسے کمزور پاتا ہے۔

ایک مجبور پرندہ اپنی بے بسی یوں بیان کرتا ہے:۔

آتا ہے یاد مجکو گذرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں

ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہی قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں

آخر میں قید کرنے والے سے پرندہ ملتجی ہے:

آزاد مجکو کردے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی، تو چھوڑ کر دعا لے

''بانگ درا'' کے اسی ۱۹۰۵ء تک کے دور میں ایک نظم ''طفل شیر خوار'' ہے جو بچوں کے لئے تو نہیں لکھی گئی مگر مخاطب ایک طفل شیر خوار ہے۔ اس نظم میں اقبال نے یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ انسان بھی طفل شیر خوار کی طرح تلون مزاج ہوتا ہے۔ ایک طفل شیر خوار نادانی کی بنا پر ایک چاقو سے بھی کھیلنے لگتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت انساں نادانی میں بچوں سے کم نہیں۔ وہ بھی بچوں کی طرح عارضی لذت کا شیدائی اور حسن ظاہری کا تمنائی ہوتا ہے۔ نیز وہ عارضی اور فانی چیزوں کے حصول میں حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔ یہ شیر خور بچہ چاقو سے کھیل رہا تھا جسے اقبال نے یہ کہہ کر چھین لیا:۔

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں، مجھے نا مہرباں سمجھا ہے تو
پھر پڑا روئے گا اے نووارد اقلیم غم
چبھ نہ جائے دیکھنا! باریک ہے نوک قلم

آہ! کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے؟
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے
گیند ہے تیری کہاں؟ چینی کی بلی ہے کدھر
وہ ذرا سا جانور ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر

اب انسانی فطرت کی کمزوری کو بچے پر اطلاق کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو
کیا تماشا ہے روی کاغذ سے من جاتا ہے تو
آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
تو تلون آشنا، میں بھی تلون آشنا

اور اس سے انسان کی نادانی پر اقبال یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسن ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری

اقبال کے کلام میں بچوں کے لئے ۱۹۰۵ء کے بعد کوئی نظم نہیں، البتہ "بانگ درا" کے دوسرے اور پھر ۱۹۰۸ء کے بعد تیسرے دور اور بعد کے مجموعے "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں اقبال نے کئی نظموں اور منفرد اشعار اور رباعیوں میں جوانان اسلام کو مخاطب کیا ہے جنہیں اقبال نے "شاہین بچے" کے لقب سے بھی نوازا ہے۔ بچوں کے ادب میں اقبال کی ایسی ہلکی پھلکی تربیتی نظمیں مشعل راہ ہو سکتی ہیں۔

●●●

محمد نفیس خاں رائے بریلوی

# مولانا عبدالسلام ندوی
## ان کی کتاب شعرالہند

جن صاحبان دین ودانش کو علامہ شبلی کی رفاقت اور ان کی علمی صحبتوں سے استفادہ کا موقع ملا ہے ان میں مولانا عبدالسلام ندوی کو کئی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے وہ عالم دین تو تھے ہی عالم علوم دنیا بھی تھے، طب اور ریاضی کے علاوہ انھوں نے تقریباہر علمی اورادبی موضوع پر کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کچھ شائع ہوئی ہیں اور کچھ اشاعت کے منتظر ہیں۔

مولانا کے مزاج ومذاق میں علامہ کا علمی، تحقیقی اور ادبی ورثہ شعوری یا غیرشعوری طور پر در آیا تھا، وہ ایک فطری ادیب تھے، ان کی علمی وادبی صلاحیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے علامہ نے انھیں الندوہ کے مقالہ نگار کی حیثیت سے اور پھر مولانا آزاد نے انھیں الہلال کے شعبہ ادارت کے لئے منتخب کیا۔ مولانا کی انشاء پردازی کا خاص رنگ تھا، نہایت ستھرا و پاکیزہ تصنع سے خالی اور آورد سے پاک، پھر ان کی انفرادی سلامت، روحانی، شگفتگی اور پختگی ان کے اسلوب کا امتیازی رنگ ہوگیا تھا، وہ اپنی تحریروں کی بے ساختگی

مین عالمانہ رنگ، اور عالمانہ رنگ میں وزن اور وزن میں نکھار پیدا کرتے تھے، یا ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ انہوں نے علامہ کے اسلوب بیان کے اتباع کی کامیاب کو شش کی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تقریباً انھیں موضوعات ومباحث پر قلم اٹھایا جو علامہ کو محبوب تھے. مثال کے طور پر علامہ نے اگر عقلیات میں الکلام، علم الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم وغیرہ لکھی تو مولانا نے ابن خلدون، امام رازی حکمائے اسلام وغیرہ۔ تاریخ اور سیرت وسوانح میں اگر علامہ نے المامون، سیرت النعمان، الفاروق اور سیرۃ النبیؐ یادگار چھوڑی ہیں تو مولانا نے اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز اور تاریخ الحرمین۔ اس کے علاوہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں ان کی محبت وصلاحیت کا اعتراف ہر کسی کو ہے، ادبیات میں اگر علامہ نے شعرالعجم لکھی تو مولانا نے بھی شعرالہند لکھ کر اپنی ادبی تنقیدی شعور کا ثبوت فراہم کیا ہے اور یہی شعرالہند موضوع گفتگو ہے۔

ہندستان میں ترکی وافغانی النسل فاتحین اور حکمرانوں کے اثر سے تقریباً ۱۸۵۷ء کے بعد تک فارسی ہی تصنیف وتالیف اور دفتری زبان تھی. اور اس وقت تک اردو شعراء کے جو تذکرے لکھے گئے ان میں اردو شاعری کے خط وخال، اس کی زبان کے نکتوں، اشعار کی نوک پلک اور شعراء کی امتیازی خصوصیات اور ان کے طرز کلام کو ظاہر کیا گیا تھا لیکن تذکروں کی زبان فارسی ہی تھی. اس موضوع پر اردو میں سب سے پہلے قلم مولانا حسین آزاد نے اٹھایا انھوں نے ۱۸۸۰ء میں آب حیات لکھ کر آغاز کیا، اور مولانا نے شعرالہند لکھ کر سلسلہ میں آخری کڑی جوڑ دی۔ آب حیات میں بہت سی خوبیوں کے ساتھ بہت سی قابل اعتراض باتیں بھی تھیں. جن کی طرف مولانا عبدالحیؒ نے گل رعنا میں نشان دہی کی، اور ان کی قلمی تسامحات اور

تاریخی فروگزاشت کا کامیاب جائزہ بھی لیا۔ لیکن اس معاملہ میں شعرالہند سب سے زیادہ ممتاز ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شعرالہند، آب حیات کا ترقی یافتہ ایڈیشن ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آب حیات میں شاعروں کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں جبکہ شعرالہند میں شاعروں کے کلام کو صرف تنقیدی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

شعرالہند میں اردو شاعری پر مولانا کے جو تبصرے ہیں وہ علمی تنقید نگاری کے شاہکار ہیں، ان میں مولانا کی انشاء پردازی اور تنقید نگاری میں وہی لذت ملتی ہے جو مے خواروں کو بلوریں جام میں مے گلفام کو دیکھنے میں ملتی ہے۔ باکمال شعراء کے شعری کمالات پر سیر حاصل بحث ہے، لیکن بیچ بیچ میں خود اعتمادی سے پھڑکتے اور دمکتے ہوئے فقروں اور جملوں سے اپنی مبصرانہ ژرف نگاہی کا اظہار کیا ہے جو ان کی تبصرہ نگاری کی جان ہے، بعض جملے دوسروں کے پورے پورے مضامین پر بھاری ہیں۔ جو ادبی و تنقیدی بحثیں کی گئی ہیں ان کے ثبوت میں بکثرت اشعار پیش کئے گئے ہیں، ان کو پڑھ کر شعر و ادب کے گوناگوں پہلوؤں پر غور فکر کرنے میں وجدانی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اسے اچھے برے شعر کے سمجھنے اور سمجھانے کا رہبر اصول معلوم ہوا، شاعری کے محرکات کا علم، بڑے بڑے شاعروں کی امتیازی خصوصیات کو جاننے کے لئے مبصرانہ نگاہ ملی۔ اور شعراء کے محاکمہ اور موازنہ کے نئے طریقے معلوم ہوئے۔

جہاں تک اسلوب اور نفس مضامین کا تعلق ہے تو مولانا نے ان دونوں کو اپنے قلم کی بہار آفرینی اور ذہن کی نکتہ وری کا سنبلستان بنادیا ہے۔ ان کی اعلیٰ ادبی تحریروں کی خوبیاں جواب تک کسی وجہ سے دوسری کتابوں میں دبی تھیں اس میں ابھر کر سامنے آگئی ہیں، پوری کتاب ادب و انشاء کا تختہ بہار ہے، ان کی تحریر کہیں نسیم

سحری، کہیں خرام صبا، کہیں سبزہ کی لہلہاہٹ کی طرح نظر آتی ہے پھر ان کی تنقیدی فکر ونظر، کہیں تبسم گل، کہیں گلگونہ شفق اور کہیں شادابی چمن کا لطف پیدا کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی پہچان یہی ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ سنجیدہ اور خشک و پر تقدس ہو وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دل آویزی کو روک نہیں سکتا، اور اس کے لئے اپنے ادبی ذوق اور اسلوب تحریر سے عاری وخالی ہو جانا ناممکن ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شعرالہند جیسی خالص ادبی وتنقیدی تصنیف میں بھی مولانا کی تحریر کی شگفتگی ورعنائی قائم ہے اور ادب وزبان کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔

شعرالہند اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں جدید قسم کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں صرف اردو شاعری کے تاریخی انقلابات وتغیرات سے بحث کی گئی ہے، اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اردو شاعری کب اور کن اسباب سے شروع ہوئی، کس طرح عہد بہ عہد بڑھی، اس کے کیا کیا انداز قائم ہوئے، کیا کیا صورتیں بدلیں، ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثرات ڈالے اور خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کی شعرالعجم اور مولانا کی شعرالہند دونوں کے مباحث یکساں ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ایک نے عجم کی ایرانی فارسی شاعری کو اپنا موضوع بنایا اور دوسرے نے ہندوستان کی اردو شاعری کو البتہ دونوں کے مابین واضح فرق ایک یہ بھی ہے کہ علامہ ایران کے فارسی شعراء کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جبکہ مولانا ان کے موضوعات، اور شعری مقاصد پر نکتہ چیں ہیں اس سلسلہ میں مقالات عبدالسلام کا مطالعہ ناگزیر ہے جسے ہم شعرالہند کی تیسری جلد کہہ سکتے ہیں جو کہ اردو

زبان وادب کی تحقیق، متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے کلام پر فنی بحث، تنقید نگاری اور انشاء پردازی کا دستاویزی مرقع ہے۔البتہ بقول پروفیسر شعیب اعظمی، شعرالعجم کی دنیا فارسی زبان کی بنا پر وسیع تھی، اس کی کوئی برابری نہیں کرسکتا۔شعرالہند کا دائرہ محدود تھا اردو دنیا غیر ممالک میں رسائی نہیں رکھتی ہے۔شبلی بہت بلندی پر پرواز کرتے ہیں اور خواص سے مخاطب ہیں، اور مولانا عبدالسلام خواص کے ساتھ عوامی قافلہ کے بھی نمائندہ ہیں۔

شعرالہند دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں شاعری کی ابتدا سے لے کر اصغر، فانی، حسرت، اکبر، جوش، اقبال وغیرہ جدید شعراء کا تذکرہ ہے، اس کے اردو شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کی شاعری اور شعراء کے الگ الگ حالات، ان کی شاعری کا پس منظر خصوصیات، عہد بہ عہد تغیرات اور اس کے اسباب وغیرہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، مقدمہ میں شعرائے اردو کے قدیم تذکروں کا مختصر تجزیہ بھی ہے، دوسرے حصہ میں شاعری کی مختلف اصناف پر تاریخی وادبی حیثیت سے مکمل ریویو کیا گیا ہے۔

آخر میں شعر کے اجزاء وعناصر اردو شاعری میں ہندستانی اثرات کا ذکر ہے، اس حصہ کے شروع میں اردو تنقید کی مختصر تاریخ بھی قلم بند کی گئی ہے اس لحاظ سے شعرالہند اردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی ۱۶ فروری ۱۸۸۳ء کو اعظم گڑھ ضلع کے علاء الدین پٹی نامی گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گاؤں کے خاندانی مکتب میں حاصل کی پھر کانپور تشریف لے گئے اور وہاں مشن کالج کے مدرس مولوی بخش احمد سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں. پھر انھیں کے ساتھ آگرہ گئے اور ایک مدرسہ میں کافیہ، شرح

جامی اور قدوری وغیرہ پڑھیں۔ وہاں سے غازی پور کارخ کیا اور اپنے ایک عزیز مولانا شبلی سے راجپوری سے متوسطات تک کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، ۱۹۰۹ء میں فراغت کے بعد تکمیل ادب میں داخل ہو کر ۱۹۱۵ء میں فارغ التحصیل ہو کر ندوہ میں میں ادب کے استاذ مقرر ہوئے ۱۹۱۰ء میں دارالمصنفین، سے وابستہ ہوئے اور انتقال کے وقت ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۶ء تک یہیں رہے۔ اور تقریباً ۴۰ برس کا عرصہ تصنیف و تالیف میں گزارا۔

آخر میں کہوں گا کہ مولانا کی شخصیت قاموسی تھی، انھیں مختلف علوم پر غیر معمولی دسترس تھی۔ اور اگر مجھے معاف کیا جائے تو کہوں کہ مولانا کی خدمات کا جائزہ لینے اور متعارف کرانے کے سلسلہ میں دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء نے جس چشم پوشی کا ثبوت دیا ہے وہ حد درجہ باعث قلق ہے۔ مولانا کی بہت سی کتابیں جو اردو ادب کا شاہکار بن سکتی ہیں، دارالمصنفین کے مسودہ خانہ میں پڑی زیور طبع سے آراستہ ہونے کی منتظر ہیں۔ خدا بہتر اقدام کی توفیق عطا کرے۔

❁❁❁

# غزل

(ابوالمجاہد زاہد)

اس طرح محوِ جمال معتبر ہوجایئے
جب نقاب اٹھے تو سر تا پا نظر ہوجایئے

خود کو روشن کیجئے، خود جلوہ گر ہوجایئے
اپنی صبح و شام کے شمس و قمر ہوجایئے

حق پرست و حق شناس و حق نگر ہوجایئے
رات کے ماحول میں نورِ سحر ہوجایئے

دھوپ کے ماروں کو جس کی چھاؤں میں راحت ملے
ریگ زارِ زندگی میں وہ شجر ہوجایئے

دیکھ کر انسان پر انسان کے ظلم و ستم
جی میں آتا ہے کہ محرومِ نظر ہوجایئے

وقت وہ ہے، چھوڑ کر سب مصلحت اندیشیاں
اور بھی دیوانہ و شوریدہ سر ہوجایئے

لوگ چن لیں جس کی تحریریں حوالوں کے لئے
زندگی کی وہ کتابِ معتبر ہوجایئے

خاک ہونا ہی مقدر میں ہے اے زاہد! تو پھر
خاکِ پائے سید والا گہر ہوجایئے

ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی

# مسدس حالی
## کچھ شاعر کے بارہ میں

خواجہ الطاف حسین حالی کی پیدائش ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء پانی پت میں ہوئی، نو سال کی عمر تھی کہ یتیم ہوگئے، بھائی کی سرپرستی میں حفظ اور ابتدائی فارسی وعربی کی تعلیم ہوئی، ۱۷ سال کی عمر میں شادی ہوگئی، یہ چپکے سے دہلی چلے گئے، وہاں ڈیڑھ سال رہے اور مولوی نوازش علی صاحب سے صرف ونحو پختہ کی پھر ایک ملازمت مل گئی جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے نذر ہوگئی، دوبارہ تعلیم کی جانب رجحان ہوا، بعض علماء سے تفسیر، حدیث، اور منطق وغیرہ پڑھی، بعدازاں جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت رہی، یہیں شاعری پروان چڑھی، نواب صاحب کے انتقال کے بعد لاہور میں ملازمت کرلی، کچھ سال بعد اینگلو عربی اسکول دہلی میں مدرسی مل گئی، یہیں سرسید خاں کی ترغیب پر ''مسدس مدوجزر اسلام'' کی تصنیف کی، جو عام طور پر مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے، آخر میں حیدرآباد دکن سے سے وظیفہ ہوگیا تھا ۱۳ر صفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال فرمایا۔ تریاق مسموم، مجالس النساء، حیات سعدی، مقدمہ شعروشاعری، حیات مرزا غالب اور حیات جاوید جیسی تصانیف چھوڑیں لیکن اس وقت مجھے صرف مسدس حالی پر گفتگو کرنا ہے۔

مسدس حالی یعنی ''مسدس مدو جزر اسلام'' میں ۲۹۷ بند ہیں اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، پوری نظم، فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، صفائی و شستگی اور سبک بندشوں کا شاہکار ہے، اگر چہ شاعر نے اس مسدس میں خواب خرگوش میں سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے لئے خوب جلی کٹی سنایا ہے اور خوب لتھاڑا ہے ایسا کہ خود کو بھی احساس ہوا یہاں تک کہ ۱۶۲ بندوں پر مشتمل ضمیمہ کہنے پر مجبور ہوئے، جس کی زبان نسبتاً بلند اور مضامین اعلیٰ ہیں لیکن ان دونوں مسدسوں میں محبوب کی شوخ کلامی اور واعظ کی شعلہ بیانی جیسا فرق ہے کہ ایسا واعظ تو ہمہ تن گوش ہو کر سنا جاتا ہے لیکن محبوب کے شوخ کلمات لطف لے لے کر دہرائے جاتے ہیں، اس ضمیمہ کو مسدس کے مقابلہ میں وہی مقام ملا جو علامہ اقبال کے ''شکوہ'' کے مقابلے میں ''جواب شکوہ'' کو ملا، آج مسدس حالی کے کتنے بند زبان زد خاص وعام ہیں، طلبہ کو یاد ہیں اساتذہ درس میں پڑھتے ہیں، واعظ وعظوں میں سناتے ہیں، کاتب اپنی تحریروں میں لاتے ہیں لیکن ضمیمہ کا شاید ہی کوئی بند کسی کی زبان پر ہو۔

مسدس حالی کا مطالعہ میں نے پہلی بار ۱۹۴۷ء میں ایک مشفق استاد کے ایما پر کیا تھا جب میں مڈل کا طالب علم تھا، دوسری بار میں نے ۱۹۶۷ء میں اس کا مطالعہ کر کے ایک شاندار فیچر تیار کیا تھا، اس وقت میں مدرسہ ثانویہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس تھا، پھر اس فیچر کو ۲۰ طلبہ کے ذریعہ ایک جلسہ میں پیش کیا گیا تھا جس کی صدارت جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نے کی تھی اور اسے بہت سراہا تھا، تیسری بار میں نے اس مسدس کا مطالعہ یہ سطریں لکھنے کے لئے کیا، ''مشک آنسیت کہ ببوید نہ کہ عطار گوید'' لیجئے قبچۂ مشک وا ہوتا ہے، خوشبو سے محفوظ ہوئیے۔

ابتدا یوں ہوئی ہے:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو نادان سمجھیں

قوم کا حال بیان ہوتا ہے:

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفاں بپا ہے گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

دور جہالت میں عربوں کا حال:

عربوں میں بت پرستی کے ساتھ، شجر، حجر، آتش، کوکب اور نہ جانے کن کن کی پوجا ہوتی تھی اور ان کی تہذیب و اخلاق کا یہ حال تھا:

جو ہوتی پیدا کسی کے گھر میں دختر تو خوف شامت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب وہ شوہر کے تیور کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جوان کے دن رات کی دل لگی تھی شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا غفلت تھی دیوانگی تھی غرض ہر طرح ان کی حالت بری تھی
بہت اس طرح ان کی گذری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھی بدیاں

## بعثت نبی رحمت

پھر اللہ تعالیٰ کو عالم کی حالت پر رحم آیا اور عالم میں خیرہ کا انقلاب لانے کے لئے اپنے محبوب، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جن کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بھٹکی قوم میں ''این تذھبون'' کی صدا لگائی اور یہ کہہ کر قوم کو آگاہ کیا۔

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر بھروسا ہمیشہ کرو تم اسی کی سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم اسی کے طلب میں مرو جب مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کی بڑائی

اسی طرح امت کی تعلیم تفصیل سے بیان کی اور تعلیم مکمل ہوگئی تو آپ کی

رحلت کا بیان اس طرح کیا۔

## خاتم المرسلین کی رحلت (صلی اللہ علیہ وسلم)

جب امت کو سب مل چکی حق کی نعمت ادا کر چکی فرض اپنا رسالت
رہی حق پہ باقی نہ بندوں کی حجت نبی نے کیا خلق سے قصد رحلت

تو اسلام کی وارث اک قوم چھوڑی
کہ دنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف

سب اسلام کے حکم بردار بندے سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبی کے وفادار بندے یتیموں کے رانڈوں کے غم خواری بندے

رہ کفر باطل سے بیزار سارے
نشے میں مئے حق کے سرشار بندے

## خلافت راشدہ

خلیفہ تھے امت کے ایسے نگہباں ہو گلہ کا جیسے نگہباں چوپاں
سمجھتے تھے ذمی و مسلم کو یکساں نہ تھا عبد و حر میں تفاوت نمایاں

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی
زمانہ میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

پھر عالم کے احوال بد کی تصویر پیش کرتے ہوئے صحابہ کرام کے انقلاب لانے کا بیان یوں پیش کرتے ہیں:

کیا امیوں نے جہاں میں اجالا ہوا جس سے اسلام کا بول بالا

بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا
زمانہ میں پھیلائی توحید مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آواز حق حق
نہیں اس طبق پر کوئی براعظیم نہ ہوں جس میں ان کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم بناؤں سے ہے ان کی معمور عالم
سر کوہ آدم سے تاکوہ بیضا
ملے گا جہاں جاؤ گے کھوج ان کا

مسلمانوں کی توجہ سے عالم کی بے مثال ترقی کا ذکر طبعیات، حیاتیات، نباتات، عمرانیات، طب، تجارت، زراعت، اصول تفسیر اور تفسیر، اصول حدیث اور حدیث، اصول فقہ اور فقہ، تاریخ، جغرافیہ، فن عروض، ادب سب میں کاملین پیدا کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

## اسلام کی برکت

رہے جب تک ارکان اسلام برپا چلن اہل دیں کا رہا سیدھا سادھا
رہا میل سے شہد صافی مصفا رہی کھوٹ سے سیم خالص مبرا
نہ تھا کوئی اسلام کا مرد میداں
علم ایک تھا شش جہت میں درخشاں

جب اسلام سے دوری ہوئی تو قوم کا کیا حال ہوا سماعت فرمایئے:

یہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا کا گیا چھوٹ سر رشتہ دین ہدیٰ کا
رہا سر پہ باقی نہ سایہ ہما کا وہ پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا

کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

برے ان پہ وقت آکے پڑنے لگے اب وہ دنیا میں بس کر اجڑنے لگے اب
بھرے ان کے میلے اجڑنے لگے اب بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب

ہری کھیتاں جل گئیں لہلہا کر
گھٹا کھل گئی سارے عالم پہ چھا کر

نہ ثروت رہی ان کی قائم نہ عزت گئے چھوڑ ساتھ ان کا اقبال و دولت
ہوئے علم و فن ان سے ایک ایک رخصت مٹیں خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت

رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

اگر کان دھر کے سنیں اہل عبرت تو سیلون سے تا بہ کشمیر و تبت
زمیں، روکھ، بن، پھول، پھل، ریت، پربت فریاد کر رہے ہیں بہ حسرت

کہ کل فجر تھا جن سے اہل جہاں کو
لگا ان سے عیب آج ہندوستاں کو

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کے قدم تھا ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا

نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم نہ درباریوں میں سرفراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایان اعزاز ہیں ہم نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم

نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں

علماء کا حال، متعدد بندوں میں سے صرف ایک بند:

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی جگر جس سے شق ہو وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

عام مسلمانوں کے عقائد واعمال کس حد تک پہنچ گئے تھے، اسے سمجھنے کے لئے ایک بہت ہی چھوٹا مکالمہ سماعت فرمایئے:

ایک شخص ایک ملا جی کا بڑا معتقد تھا، وہ ایک غیر مسلم کے ساتھ کاروبار کرتا تھا، جب تب ملا جی کو ہدیہ پیش کرتا مگر وہ غیر مسلم ان کو گھاس نہ ڈالتا جو ملا جی کو بہت محسوس ہوتا، ایک روز اپنے معتقد کو ڈانٹتے ہوئے بولے:

ملا جی: تم کو بار بار سمجھایا مگر تم سمجھتے ہی نہیں ہو آخر اس کے ساتھ کیوں کاروبار کرتے ہو؟

معتقد: حضور بہت سمجھایا کہ ہمارے ملا جی کو کچھ نذرانہ دے دیا کرو تا کہ کاروبار چمکے۔ وہ کہتا ہے کاروبار چمکنے اور ملا جی کو نذرانہ دینے میں کیا جوڑ ہے؟

ملا جی: سنو! دیکھو وہ بت پرست ہے اور بت پرست کافر ہوتا ہے، اس کے ساتھ کاروبار مت کرو۔

معتقد: حضور عیسائی، مجوسی اور نجومی کے بارے میں کیا حکم ہے ان سے تعلقات رکھے جائے یا نہیں؟

ملا جی: اگر وہ ہمارے بزرگوں سے اعتقاد رکھتے ہوں تو تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں ورنہ سمجھ لو عیسائی عیسی کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، مجوسی آگ پوجتے ہیں نجومی ستاروں میں اعتقاد رکھتے ہے یہ سب کافر ہے ان سے مقاطعہ لازم ہے۔

ایک دوسرا معتقد: (نذرانہ پیش کرتے ہوئے) حضور یہ لڈو قبول فرمایئے کل انیا شہید کے مزار پر نذر پیش کی تھی اس میں سے آپ کے لئے تبرک لایا ہوں ملا جی: لاؤ، لاؤ، اللہ تم کو خوش رکھے، وہابیوں نے تو ایڑی چوٹی کا زور لگا ڈالا کہ لوگ قبروں پر چڑھاوے نہ چڑھائیں، نذریں نہ مانیں، حضور کو مختار کل نہ سمجھیں لیکن شاباش تم لوگوں نے وہابڑوں کی کوشش پر پانی پھیر دیا۔

انھیں حالات کو مولانا نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر کواکب میں مانے کرشما تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جاجا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں ہوا جلوہ گر حق زمین و زماں میں

رہا شرک باقی نہ وہم وگماں میں وہ بدلا گیا آکے ہندوستاں میں

ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت نہ نعمانی وشافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت مقلد کرے نامقلد پہ لعنت

رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دین خدا پر ہنسے سارا عالم

وہ دیں جس نے الفت کی بنیاد ڈالی کیا جمع دوراں کو نفرت سے خالی
بنایا اجانب کو جس نے موالی ہر اک قوم کے دل سے وحشت نکالی

عرب اور حبش ترک وتاجیک ودیلم
ہوئے سارے شیر وشکر مل کے باہم

تعصب نے اس صاف چشمہ کو آکر کیا بعض نے خار وخس سے مکدر
بنے خصم جو تھے عزیز وبرادر نفاق اہل قبلہ میں پھیلا سراسر

نہیں دستیاب ایسے اب دو مسلماں
کہ ہو ایک کو دیکھ کر ایک شاداں

اگر بھولتے ہم نہ قول پیمبر کہ ہیں سب مسلمان باہم برادر
برادر ہے جب تک برادر کا یاور معین اس کا خود ہے خداوند داور

تو آتی نہ بیڑے پہ اپنے تباہی
فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

## ناقص تعلیم کا حال

ایک ملا جی نے محمد رسول اللہ میں رسول پر الا داخل کر کے لکھا، پوچھا گیا کیا یہ غلط نہیں ہے؟ کہنے لگے غلط کیوں ہے، اللہ معارفہ ہیں تو رسول بھی معارفہ ہوگا ایسے ہی ملاؤں کا یہ حال بیان کیا گیا ہے۔

نہ حجت رسالت پہ لا سکتے ہیں وہ نہ اسلام کا حق جتا سکتے ہیں وہ
نہ قرآں کی عظمت دکھا سکتے ہیں وہ نہ حق کی حقیقت بتا سکتے ہیں وہ
دلیلیں ہیں سب آج بیکار ان کی
نہیں چلتی توپوں میں تلوار ان کی

## جب کوئی قابلیت ہی نہیں تو:

نہ سرکار میں کام پانے کا قابل نہ دربار میں لب ہلانے کا قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل
نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماکر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر

## شعر وادب کا حال

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر فلک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم دین جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

## شرفاء کی اولاد

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے تباہ ان کی حالت بری ان کی گت ہے
کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے کی لت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی
اگر شش جہت میں کوئی دلربا ہے تو دل ان کا نادیدہ ان پر فدا ہے
اگر خواب میں کچھ نظر آ گیا ہے تو یاد اس کی دن رات نام خدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد ہے یاں
جسے دیکھئے قیس وفرہاد ہے یاں

## مرد دانا کی بات

کسی نے اک مرد دانا سے پوچھا کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا ''عقل جسے ملے دین ودنیا'' کہا ''گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرا''
کہا ''پھر اہم سب سے علم وہنر ہے
کہ جو باعث افتخار بشر ہے''
کہا ''گر نہ ہو اس کو یہ بھی میسر'' کہا مال ودولت ہے پھر سب سے بڑھ کر
کہا ''در ہو یہ بھی اگر بند اس پر'' کہا ''اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر
وہ ننگ بشر تا کہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

## مرد دانا کی بات کا انطباق و تنبیہ

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو مبادا کہ وہ ننگ عالم تمھیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو
وگر نہ یہ قول آئے گا راست تم پر
کہ ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر

مولانا میں قوم کو بیدار کرنے اور آگے بڑھانے کی ایک دھن تھی، ادھر سرسید کی خواہش سے برٹش حکومت کی تعریف بھی مقصود تھی، لہٰذا اس پر کئی زوردار بند لکھے گئے جسے بعض محبان وطن اور علماء نے اچھی نظر سے نہ دیکھا اور چاپلوسی پر محمول کیا، پھر بھی ان بندوں کی سحر بیانی نے مقبولیت میں کوئی کمی نہ آنے دی بلکہ وہ منتخب ہوکر درسی کتابوں میں آگئے صرف دو بند ملاحظہ ہوں:

## حکومت برطانیہ

حکومت نے آزادیاں تم کو دیں ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن واماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا
کرو قدر اس امن وآزادگی کی کہ ہے صاف ہر سمت راہ ترقی
ہراک راہرو کا زمانہ ہے ساتھی یہ ہر سو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا خطرہ نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے

اس طرح چھ بند ایسے ہیں کہ جس حکومت پر یہ صحیح معنی میں منطبق ہوں تو اس سے اچھے انداز بیان میں کسی شاعر کے لئے بیان کرنا مشکل ہوگا۔

## نتیجہ مایوسی

امیروں کی تم سن چکے داستاں سب چلن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب بگڑنے کو تیار بیٹھے ہیں یاں سب
یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے

یہ جو کچھ ہوا ایک شمہ ہے اس کا کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانہ نے اونچے سے جس کو گرایا وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا
نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

## اس مسدس کے بارہ میں خود مصنف کے رائے

نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضامین اکثر طعن وملامت پر مشتمل تھے، قوم کی خرابیاں چن چن کر بیان کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ وسنان کا کام لیا گیا تھا، ناظم کی نسبت قوم کے اکثر ابرار اور اخیار مذہبی سوءظن رکھتے تھے، تعصب عموماً کلمۂ حق سننے سے مانع تھا بایں ہمہ تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف وجوانب میں پھیل گئی۔

مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اس نے زمین شور میں تخم ریزی نہیں کی، اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گمراہ نہیں ہے، وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں مگر رستے کی تلاش میں چپ وراست نگراں ہیں۔

اپنے اسلوب کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

''مگر یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اسی قدر مایوس کرنے والا بھی تھا، مصنف کے دل کی آگ بھڑک بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ میں سرایت کر گئی تھی، نظم کا خاتمہ ایسے دلشکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہوگئیں، اور تمام کوششیں رائگاں نظر آنے لگیں، شاید اس خرابی کا تدراک کچھ نہ ہوسکتا اگر قوم کی توجہ مصنف کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا نہ کرتی اور قوم کو ایک نئے خطاب کا مستحق نہ ٹھہراتی (چنانچہ) ایک ضمیمہ، مقتضائے حال کے موافق اصل مسدس کے آخر میں لاحق کیا گیا۔''

(اقتباسات از ''دوسرا دیباچہ'' برائے ضمیمہ)

ضمیمہ کے جواب میں قوم کی جانب سے بندہ عرض کرتا ہے۔

شیشہ دکھا دیا تو نے قصیدہ نہ اب پڑھو
کالک کو اپنی منھ کی چھڑانا ضرور ہے

●●●

مولانا انوار عالم ندوی

# علامہ شبلی نعمانیؒ کی اردو شاعری میں
## ملی احساسات کی ترجمانی

شاعری اور نثر نگاری جذبات وخیالات اور احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی دو الگ الگ راہیں ہیں۔ایک ردیف وقافیہ کی پابند پگڈنڈیوں سے ہوکر گزرتی ہے دوسری اس سے آزاد۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اصلاً نثر نگار تھے۔لیکن ان کے گرد وپیش کے حالات وواقعات ملک وقوم کے احوال وکوائف سیاست وسماج کی ناہمواریاں اور بوالعجبیاں کبھی کبھی ان کے جذبات وخیالات کو شعری لے میں ابھار دیتی تھیں۔وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ کبھی کبھی شعروسخن کی کاٹ اتنی گہری اور اتنی کارگر ہوتی ہے کہ وہ ہزارہا سخن سازیوں پر بھاری ہوتی ہے۔لہٰذا انہوں نے اپنے جذبات خفتہ کے ہیجان کو راہ دکھانے کے لئے کوچۂ شعروسخن میں بھی قدم رکھا۔

قسام ازل نے علامہ شبلی نعمانیؒ کے سینہ میں جو دل رکھا تھا وہ بہت ہی دردمند حساس اور ملی غیرت وحمیت سے سرشار تھا۔اسلام واسلامی تمدن،اسلامی تاریخ اسلامی علوم وفنون پر وہ شیفتہ وفریفتہ تھے۔وہ اسلام کی تصویر کو مجسم شکل میں دیکھنے

کے خواہش مند تھے۔کوئی گستاخ ہاتھ اس کی طرف اگر بڑھتا تو دل کے پھپھولے شعری شراروں میں ڈھل ڈھل کر نکلتے خود روتے اور دوسروں کو رلاتے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کی شاعری کو اگر ان کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی شاعری سے وہی کام لینا چاہتے تھے جو اپنی نثر سے لے رہے تھے یعنی مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بحال کرنا، انہیں احساس کمتری سے نکال کر ان کے اندر ملی احساس کو بیدار کرنا اور ان کے سامنے بلند نصب العین رکھنا۔اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے کبھی مدوجزر اسلام کی تصویر کھینچی اور کبھی صبح امید کی کرن دکھائی۔اب ہم مثالوں سے اپنی بات واضح کرتے ہیں۔

اپنی مثنوی کے آغاز میں وہ مسلم قوم کے اقبال کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:۔

وہ قوم کی جان تھی جہاں کی
جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پر نثار فتح و اقبال
کسریٰ کو کر چکی تھی پامال
گل کر دیئے تھے چراغ جس نے
قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے

آگے قوم کی تبدیلی کا تذکرہ بڑے کرب کے ساتھ کرتے ہیں:

کیوں تیرِ ستم کے ہو نشانہ
بگڑا ہے تمہیں سے کیوں زمانہ
کس نے تمہیں اوج سے اتارا
اقبال نے کیوں کیا کنارا

کیوں بار ہو تم دلِ زمیں پر
کیوں برق بلا گری تمہیں پر
کس بیچ میں رہ گئے ہو پھنس کر
کیا ہے کہ اجڑ گئے ہو بس کر

آخر میں اسلام کی عظمت رفتہ کی طرف کوچ کا نقارہ بجاتے ہوئے مدعیان اسلام کے ضمیر کو جھنجھوڑا ہے اور انہیں میدان عزم و عمل میں اترنے کی راہ دکھائی ہے!

اے مدعیانِ حب اسلام
حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ
ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی
اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روشن وہی ہے!
دن ڈھل بھی گیا تپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی
اتنک ہے گہر میں آب باقی

مثنوی ہی کیا مسدس پڑھئے قصائد دیکھئے اخلاقی، مذہبی اور سیاسی نظموں پر نظر ڈالئے علامہ شبلیؒ کا ملی احساس ہر جگہ متلاطم نظر آئے گا کہیں طغیانی کے ساتھ کہیں قدرے خفیف۔ سرسید کے قومی تھپڑ پر اپنے درد و سوز کا اظہار کرتے ہوئے

کہتے ہیں۔

ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ گروہِ شرفاء
صاحب افر و اورنگ تھے جن کے آباء
قوم کے عقدۂ مشکل کے ہیں جو عقدہ کشاء
ایکٹر بن گئے وہ اسٹیج پہ ہیں جلوہ نما
قوم کے خواب پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں
ایکٹر یہ نہیں عبرت کی تصویریں ہیں

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۳ء میں پڑھے گئے قصیدہ میں قوم کی حالت زار کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں ان کا باطنی اضطراب پوری طرح جلوہ گر ہے اور قوم کی نکبت وافلاس کے اسباب سمٹ آئے ہیں۔

ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سن کر
کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنون احساں ہے
مزے لیتے ہیں پہروں تک کسی سے جب یہ سنتے ہیں
کہ یورپ دولت عباس کا اب تک ثناخواں ہے
نہیں کوئی ہاں گھر تک مگر چرچے یہ رہتے ہیں
کہ اب تک قصر حمرا قبلہ گاہ رہ نورداں ہے
ہیں خود ان پڑھ مگر اس زعم میں اتراتے پھرتے ہیں
کہ دنیا میں ہمیں سے زندہ اب تک نام یوناں ہے
نظر آتے ہیں ہم کو عیب اپنے خوبیاں بن کر
ہم اپنے جہل کو بھی یہ سمجھتے ہیں کہ عرفاں ہے

بسر ہوتی ہے گر اوقات فیاضی پہ غیروں کی
تو سمجھتے ہیں کہ بس زہد اور توکل کی یہی شاں ہے
حمیت اور خودداری نہیں ہے گر طبیعت میں
تو اچھا ہے کہ مسکینی تو اول شرط ایماں ہے
طبیعت میں اگر ہیں فتنہ پردازی کے کچھ جوہر
تو دعوی ہے کہ تدبیر اور سیاست فرض انساں ہے
وہ قوم اور وہ جماعت جس میں یہ اخلاق محکم ہیں
بلائیں اس پہ جو آئیں وہ کم ہیں اور بہت کم ہیں

ایک اور جگہ زوال وانحطاط کے اسباب کا بیاں یوں کیا ہے:

الغرض عام ہے جو چیز وہ بے دینی ہے
صاف یہ بات ہے دھوکا نہیں ابہام نہیں
ان حقائق کی بنا پر سبب پستی قوم
ترک پابندی اسلام ہے اسلام نہیں

قوم کو نکبت وافلاس کی دلدل سے نکال کر اقبال کی راہ دکھانے، شریعت کے بندھن سے آزاد لوگوں کو شریعت کا پابند بنانے اسلام کے صاف شفاف چہرہ کو بے غبار شکل میں اقوام عالم کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری گروہ علماء پر ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے محسوس کیا کہ علماء اپنی اس ذمہ داری سے غفلت برت رہے ہیں۔ اور اپنے ہی بھائیوں کی پگڑیاں اچھالنے میں مصروف ہیں تو علامہ شبلی نعمانیؒ نے شکایت کی:

ایک روز مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ کیا آپ
کچھ حالت یورپ سے خبردار نہیں ہیں

آمادہ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں
ہر چند ابھی مائل اظہار نہیں ہیں
افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا
یا ہیں تو بقول آپ کے دیں دار نہیں ہیں

اس کا جواب علامہ شبلی نعمانیؒ کو کیا ملا ذرا دل کے کانوں سے سنئے ۔

جھلا کے کہا یہ کہ یہ کیا سوء ادب ہے
کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں
کرتے ہیں شب وروز مسلمانوں کی تکفیر
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بے کار نہیں ہیں

طبقہ علماء کے غفلت کے پردہ کو چاک کرنے کے ساتھ ساتھ مغرب زدہ طبقہ کے دل ودماغ پر بھی دستک دی:

آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم
اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار
بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن تھا
کہ نہ گھٹتا کبھی ناموس شریعت کا وقار
آج ہر بات میں ہے شان تفرنج پیدا
آج ہر رنگ میں یورپ کے نمایاں ہیں شعار
ہیں شریعت کے مسائل بھی وہیں تک محدود
کہ جہاں تک انہیں معقول بتائیں اغیار

ایک جگہ مغرب زدہ طبقہ کی غلامانہ روش پر بڑے طنز کے ساتھ کہتے ہیں:

آپ اس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گے کبھی
دل سے جائے گا نہ تعلیم غلامی کا اثر
جب کہیں بھی کوئی پہلوئے غلامی ہوگا
ہر طرف پھر کے اسی نقطہ پر ٹھہرے گی نظر

مرکز قومی کا فقدان شیرازہ قوم کا انتشار علامہ شبلی نعمانیؒ کو مرغ بسمل کی طرح تڑپاتی تھی۔ یہ تڑپ نالہائے موزوں بن کر ان کی زبان سے یوں ادا ہوئے:

ادب کوئی مرکز قومی ہے نہ توحید خیالی
نہ کوئی جادہ مقصد ہے نہ کچھ توشہ زاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازہ قوم
خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد
ذرے جس طرح ہو جاتے ہیں اڑاڑ کے فنا
یونہی ہو جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کیا ۱۹۱۲ء میں یورپ سلطنتوں کے اشاروں پر بلقان کی ریاستوں نے ترکی پر دھاوا بول دیا۔ ان حالات نے علامہ شبلی نعمانیؒ کو شعلہ جوالہ بنا دیا۔ ''شہر آشوب اسلام'' کے نام سے ایک درد بھری نظم لکھی جس نے مسلمانوں کو خون کے آنسو رلائے۔ اس نظم کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ آج بھی اسے سنکر اشکوں کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک!

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک!
مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جاں کب تک!

وہ بڑے کرب اور جوش کے ساتھ کہتے ہیں:

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحان کب تک!
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک!

ان کو منڈلاتے ہوئے خطرات کے بادل کا اندازہ ہوا تو بے ساختہ پکار اٹھے:

کہیں اڑ کے یہ دامان حرم کو بھی نہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک!

قوم کو آواز دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

زوال دولت عثمان زوال شرع وملت ہے
عزیز و فکر فرزند وعیال خانماں کب تک!
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ طیاراں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے یہ چیستاں کب تک!

کہیں سے جب انہیں امید کی کرن نظر نہیں آئی تو انتہائی حسرت کے ساتھ کہا:

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی کہاں جائیں
کہ اب امن وامان شام ونجد وقہرواں کب تک!

۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں ایک طبی وفد ترکی کے محاذ جنگ پر بھی بھیجا گیا۔ وفد کی واپسی پر علامہ شبلی نعمانیؒ نے ڈاکٹر انصاری کے پاؤں چومنے چاہے تو ڈاکٹر صاحب نے معذرت چاہی۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے فرمایا ''یہ تمہارے پاؤں نہیں اسلام کے مجسمہ غربت کے پاؤں ہیں'' وفد کے استقبال میں علامہ شبلی نعمانیؒ نے ایک بڑی پر درد نظم کہی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری
تمہارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہیں
کہ تم نے غازیانِ دیں کی کی ہے ناز برداری
جنون جوش اسلامی جو کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
سہارا کوئی امید کا اب بھی/ اگر باقی
تو تم نے وہ رموز قوت مکتوں بھی دیکھے ہیں

ابھی جنگ بلقان کا معرکہ گرم تھا۔ کہ سر آغا خاں نے ترکوں کو مشورہ دیا کہ یورپ کو چھوڑ کر ایشیا میں آ بسیں۔ وہ یورپ کی دست درازیوں سے مامون ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کو اس مشورہ نے چراغ پا کر دیا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کی حساس طبیعت کے لئے بھی یہ مشورہ زخم پر نمک پاشی سے کم نہ تھا۔ اس کا جواب انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں دیا معرکہ بلقان میں مسلمانوں کے شکست کی خبریں مولانا کے ملی احساس پر ضرب کاری لگا رہی تھیں اچانک خبر ملی کہ اڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ ملت کی فتح و کامرانی کا جواب دیکھنے والی ہستی کو امید کی کرن نظر آئی اور

ترکوں کو مبارک باد پیش کی۔

اے ترک اے مجسمہ کبریائے حق
اے وہ کہ جس پر عالم ہستی کو ناز ہے
پشت وپناہ ملت ختم الامم ہے تو
تو آج زور بازوئے شاہ حجاز ہے
رنگیں ہے تری تیغ سے ہر صفحۂ وجود
مغرب ترا ہی عرصہ گہ ترک نازہے
تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جاں ستاں
اب بھی فنائے ہستی دشمن کا راز ہے

حکومت برطانیہ سے مسلمانوں نے اپیل کی وہ مسلمانوں کے احساسات کا پاس ولحاظ کرے حکومت نے اس سے تغافل برتا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ اس تغافل سے تیغ براں بن گئے:

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساس مسلم کا
مگر اس کا اثر جو کچھ ہے وہ ہندوستاں تک ہے!
مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیری ملت
عراق وفارس و نجد و قیرواں تک ہے!
منافق ہے جو کہتا ہے کہ میں ترکی سے یکسو ہوں
یہ وہ الفاظ ہیں جنگی جہانگیری زباں تک ہے!

ابھی معرکۂ بلقان سرد نہیں ہونے پایا تھا کہ ۳۱/اگست ۱۹۱۳ء کان پور کے خونی حادثہ نے مسلمانوں کے تن بدن میں آگ لگا دی ہوا یہ کہ شہر کان پور میں

میونسپلٹی محلہ مچھلی بازار میں ایک سڑک نکالی جس کی زد میں ایک مسجد کا وضوخانہ آیا جب کہ اسی کے قریب ایک مندر کو اس سے صاف بچا لیا گیا۔اس واقعہ نے مسلمانوں کے قلب وجگر پر تیر ونشتر کا کام کیا۔کان پور کے مسلمان جن میں بچے بھی شامل تھے۔مسجد کی منہدم دیوار کو اپنے ہاتھوں سے چننے لگے۔دفعتہً مسجد پر متعین فوج نے گولیاں برسا کر انہیں چھلنی کر دیا۔دیکھتے ہی دیکھتے سارا ہندوستان آتش فشاں بن گیا۔اس واقعہ پر علامہ شبلی نعمانیؒ کی شعلہ نفس طبیعت نے جو اشعار کہے ہیں اس میں اسلامی جوش وخروش کا ایک طوفان برپا ہے :

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم ؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں

علامہ شبلی نعمانیؒ بڑی حسرت کے ساتھ اس وقت اپنے کانپور سے دوری کا ذکر کرتے ہیں۔

شہیدان وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

کان پور کے اس حادثہ نے آپ کے ملی احساس میں ہیجان پیدا کیا تھا اس نے قوم کے اندر جذبہ سرفروشی کو یوں بیدار کیا۔

یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنے چند اشعار میں قوم کو 'پدرم سلطان بود' کے نعرے لگانے کے بجائے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ خصوصاً نوجوانوں کو مخاطب کر کے قوم کی ترقی کے لئے اپنی قوت کو یکجا کرنے کو کہا ہے۔ اب میں اپنے اشہب خامہ کی تکمیل تھام کر اپنی بات کو انہیں اشعار پر اس امید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے نوجوانوں سے جس ملی کام کا مطالعہ کیا ہے۔ اس پر وہ لبیک کہیں گے۔ وہ کہتے ہیں۔

ہاں کمر بستہ ہو اے قوم ترقی کے لئے
آج کے کام میں اندیشۂ فردا کیسا
نوجوانو یہ زمانہ کو دکھا دینا ہے
اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا!

●●●

مولانا عبدالسبحان ندوی
مدرسہ ضیاء العلوم
میدان پور، تکیہ، رائے بریلی

# اقبال کی شاعری اور غیرت ملی وحمیت دینی

بیسویں صدی میں ملی قیادت کا سہرا جن نامور فرزندان اسلام کے سر بندھا شاعر مشرق علامہ اقبال ان کی صف اوّل میں نظر آتے ہیں۔ اسلام کے اس غیرت مند سپاہی نے اس وقت ہوش سنبھالا جب سارا عالم اسلام لہولہان تھا، خون مسلم بڑی ارزانی سے بہہ رہا تھا، ترک ناداں نے خلافت کی قبا چاک کردی تھی۔ وہ قبا جس نے صدیوں تک مسلمانان عالم کو ملی غیرت اور قومی خودداری کا درس دیا تھا۔ بلاد اسلامیہ ایک ایک کرکے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل رہے تھے۔ شام، عراق، مصر، سوڈان، طرابلس، ایران اور جزیرۃ العرب یہ ترکی خلافت کے جگر پارے تھے جو دشمن نے بغیر چبائے ہضم کرلئے، اسلامی عہد کا ہندوستان داستانِ پارینہ بن چکا تھا۔ تہذیب نو کے نام پر ایک بھیڑیا صفت قوم ملت اسلامیہ کا خون چوس رہی تھی، چونہ شاعر مشرق کے ذریعہ پوری ملت کو (بالخصوص ملت اسلامیہ ہندیہ کو) غیرت وحمیت کا سبق دینا تھا اس لئے حکمت خداوندی نے اس کے لئے جو وقت چنا

وہ نہایت مناسب ترین تھا۔ مبدأ فیاض کی طرف سے وہ ایک داغ داغ دل لے کر آیا تھا۔ اس نے زار زار دنیا کو دیکھا، اسلامیان عالم کی سطوت و اقبال کے واقعات پڑھے اور اپنے زمانے کی بے کسی بھی دیکھی بس تڑپ اٹھا اور پوری ملت کو تڑپایا۔ اس کی شاعری مرثیہ خوانی نہیں تھی۔ مرثیے صرف رلاتے ہیں جوش عمل پیدا نہیں کرتے، اس کی شاعری تخیل کی پرواز نہیں تھی، تخیل کی پرواز ٹھوس صداقتوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں کرتی۔ اس کی شاعری صرف گذرے ہوئے زمانے کی کہانی نہیں تھی۔ یہ کہانی بہت سوں نے سنائی لیکن وہ تڑپ پیدا نہیں ہوئی، اس کی شاعری ترقی پسندوں کی طرح بلند بانگ دعووں سے لبریز نہیں تھی، دعوے اکثر و بیشتر کھوکھلے ہوتے ہیں اس کی شاعری کا لفظ لفظ صداقت تھا۔ مقصدیت اس کی شاعری کا بیّن نشان تھی۔ اس نے عظمت اسلاف کا ذکر کیا لیکن بے جا فخر و غرور پیدا نہیں کیا۔ اس کی شاعری نے تڑپ سکھائی اور ہر درد اس کی شاعری حسن و عشق، گل و بلبل اور وصل و ہجر کے فرسودہ اور پامال راستوں سے آلودہ نہیں ہوئی اس کا کمال یہ تھا کہ ہزار دفعہ رلانے کے باوجود اس کی شاعری میں پسپائی، بے چارگی، درماندگی اور پست ہمتی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ حق یہ ہے کہ اس نے شاعری کی نئی طرح ڈالی، اپنی شاہراہ الگ نکالی جس کا وہ اولین و آخری مسافر تھا۔ اقبال کا پیغام کوئی اور دینا چاہتا تو شاید وہ نواوعظ بن جاتا جس میں نہ کوئی جان ہوتی، نہ روح، نہ حوصلوں کی بلندیاں ہوتیں نہ عزم کی جولائیاں، یہ صرف اقبال کا تنہا کمال تھا کہ شان ایمانی کو اپنی شاعری میں ایسے البیلے انداز میں پیش کیا کہ خالص ترقی پسند شعراء بھی عش عش کر اٹھے، اور یہ بات ایک مرتبہ پھر ثابت ہوئی کہ اسلامی شاعری کوئی بے کیف بے رنگ اور بے مزہ شاعری نہیں ہے جو وعظ و نصیحت کے چند کلمات پر مشتمل ہو۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں مغربی تہذیب پر کڑی تنقید کی جو نفوس مستحکم صداقتوں پر مبنی تھی۔ان کی تنقید کا انداز منہ چڑانے کا نہیں تھا۔ نہ انہوں نے خواہ مخواہ مغربی مفید ایجادات پر تنقید کر کے تنگ نظری کا ثبوت دیا، وہ مغربی تہذیب کی رگ رگ سے واقف تھے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں۔

''مغرب پر اس کی اتنی گہری نظر تھی کہ کوئی بڑے سے بڑا جدید آدمی اٹھ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اقبال سے زیادہ مغرب کو جانتا ہے، اور اس سے زیادہ مغرب کے فلسفہ اور مغربی علوم سے واقف ہے۔اس لئے جب اقبال نے مغربیت مغربی مادہ پرستی مغربی فلسفے اور مغربی افکار پر چوٹ لگائی تو مسلمانوں پر مغرب کی جو مرعوبیت طاری تھی وہ کافور ہونے لگی اور واقعہ یہ ہے کہ اس مرعوبیت کو توڑنے میں اکیلے اقبال کا کارنامہ سب سے بڑھ کر ہے۔(۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

''تعلیم جدید نے اس صدی کے اندر ان سے بہتر نمونہ پیش نہیں کیا۔ان کو جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا جا سکتا ہے۔مشرق کے اہل نظر اور ذہن افراد میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے مغربی تہذیب وافکار کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس قدر جرأت کے ساتھ اس پر تنقید کی ہو''(۲)

ان کو اپنے مطالعہ کی روشنی میں اور مغربی تہذیب وفلسفہ سے براہ راست واقفیت کی بناء پر اس کا کامل یقین تھا کہ یہ تہذیب زیادہ مدّت تک پنپ نہیں سکتی، اس میں نہ کوئی جان ہے نہ پیغام یہ جلد ہی اپنا نشانہ خود بنے گی، فرماتے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرلے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

مغربی نظامِ تعلیم کو یکسر دین واخلاق کے خلاف قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین مروت کے خلاف

یہ طنزیہ انداز بھی ملاحظہ ہو:

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں
پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مارڈینگ
بستے ہیں ہند میں جو خریداری ہی فقط
آغا بھی لیکے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
میرا یہ حال بوٹ کی تو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ مرے فرش پر نہ رینگ

مغربی معاشرت کی رنگینی کو وہ خونی لہو سے تعبیر کرتے ہیں:

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش وامروز ہے مستانہ

مغربی طرز کی جمہوریت کو وہ نظامِ حکومت کے فساد کی جڑ قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی وتقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب ونظر کی رنجوری

ان کو ذہنی غلامی سے از حد نفرت تھی، اور ان قائدین کو وہ قوم کا ریزن سمجھتے تھے جو ان ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر اہل مغرب کی گود میں جا بیٹھے، خود بھی ڈوبے اور اپنی کو بھی لے ڈوبے، ایسے قائدین پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہو:

ہو اگر قوت فرعون کی درپردہ موید
قوم کے حق میں ہے لعنت وکلیم اللہی
امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاک باز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند
ہمیشہ مور ومگس پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفت کہ عنکبوت ان کی کمند

## ملت اسلامیہ کا وسیع ترین تصور

ان کی شاعری کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں ملت اسلامیہ میں وسیع تصور دیا، وہ ملت کو اوطان واقوام اور جنس ورنگ میں تقسیم کرنے کو سم قاتل سمجھتے تھے، وہ اس تقسیم کو ثانوی حیثیت دینے کے واسطے بھی تیار نظر نہیں آتے، انہوں نے وطنیت کے پیرہن کو مذہب کا کفن قرار دیا اور طعن کے تنگنائی سے نکال کر وہ ملت کو قوم کی پاسبان کے بہر بیکراں میں لانا چاہتے تھے۔

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ طوران
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بیکراں ہوگا
غبار آلودہ رنگ ونسل ہیں بال وپر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرنشاں ہوجا

بطان رنگ وبو کو چھوڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

اکبرالہ آبادی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "مگر خدارا آج کل صرف کعبہ ہی بنایئے، ورنہ مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھر جائے گا اس وقت اسلام دشمن سائنس نہیں ہے مگر اس کا دشمن یورپ کا نیشنلزم Territorial ہے، جس نے ترکوں کو خلافت کے خلاف اکسایا، مصر میں مصریوں کے لئے آواز بلند کی، ہندوستان کو Panindian ڈیموکریسی کا بیان خاک دکھایا، تاہم مذہب اسلام کا ایک ضروری پہلو تو بہت ہے جس کا مرکز کعبۃ اللہ ہے۔(۳)

اسلامی قولیت کی علاوہ کسی اور قومیت کے وہ قائل نہیں تھے، ان کو اس کا شکوہ تھا کہ:

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

یہی وجہ ہے کہ جب ترک ناداں نے خلافت کی قبا چاک کی تو آپ کا دل یوں ٹوٹا کہ پھر کبھی نہ جڑ سکا ایک غم اسلاف کی میراث کے لٹ جانے کا تھا دوسرا غم ملت کی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کا اور تیسرا غم وقت کی زبوں حالی و درماندگی کا تھا اس صدمے

نے آپ کو جو چوٹ پہنچائی وہ اشعار کی زبان میں یوں ابھر کر سامنے آئی:

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروی درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
قافلوں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

## یادِ ماضی

انھیں ماضی سے عشق تھا وہ ہر چیز کے ماضی میں جھانکنے کے قائل وہ مستقبل کی شاہراہ کو ماضی کی قندیلوں سے دیکھنا چاہتے تھے تاریخ سے ان کو حد درجہ وابستگی تھی اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے اشعار کو سمجھنے کے لئے تاریخ دانی کی اس قدر ضرورت پڑتی ہے کم سے کم کسی اور اردو شاعر کو سمجھنے کے لئے اتنی ضرورت نہیں پڑتی، ماضی سے وابستگی کا نتیجہ تھا کہ وہ دور جدید کی چمک دمک سے کبھی متاثر نہیں ہوئے خاص طور سے ماضی اسلام میں ان میں ایک ایسی آگ بھر دی تھی جس کے شعلے خود بخود بھڑک اٹھتے تھے اور دور حاضر کے تمام شیش محل اس سے مجسم ہو جاتے تھے۔ان کی اولین نظموں میں ایک نظم کوہ ہمالہ سے خطاب بھی ہے اس وقت ان کی عمر یہی کوئی ۲۰۔۲۵ سال کے لگ بھگ ہوگی اس نظم کے یہ آخری چند بند ملاحظہ ہوں:

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آباء انساں جب بنا دامن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

ان کی پوری نظم پیچھے کی طرف دوڑنے میں گزری یہ تاریخی شوق جب اسلامی ذوق میں ڈھل گیا اور مسلمانوں کے عروج وکمال کی داستانیں خود براہ راست پڑھیں تو ان کا حال ہی کچھ اور ہوگیا پہلے سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہونے والا شاعر اب ہندوستانی محدود ماحول کو چھوڑ کر کل کائنات کو اپنی میراث قرار دینے لگا اور چین وعرب ہمارا ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا کہہ کر اپنی شناخت ظاہر کی، زمانہ کچھ اور آگے بڑھا یورپ وجرمنی سے بھاری بھرکم اسناد حاصل کی لیکن عشق کی جو آگ لگی تھی وہ بڑھتی ہی چلی گئی، دنیا کی سیاست کی حالی نے تو صرف دہلی کی سیاحی سے منع کیا تھا کہ سیاح وہاں کے کھنڈر سے بہت داغ لے کے آئے گا لیکن اقبال دنیا کے کونے کونے سے لہولہو دل لے کر آئے دنیا کا آخر وہ کون سا حصہ تھا جہاں مسلمانوں کی عظمت کی داستانیں ثبت نہیں ہیں، عظمت شاہان اسلام اور دل شاعر اسلام ایک طرف لٹی ہوئی تہذیب کے نشان دوسری طرف قصہ درد سنانے والی زبان، بس آگ لگادی اور وہ آگ ایسی لگی کہ آج بھی کلام اقبال میں وہی گرمی رفتا ہے جو محفلوں کو پھونک دے، یہ صرف زبان کا کمال نہیں تھا، یہ عشق کی آگ تھی، محبت کی گرمی تھی، جذبات کی تپش تھی، اور قلب کی حرارت تھی یہ صرف ساز عجم نہ تھا یہ سوز عرب

بھی تھا۔

علامہ نے اس سیاحی میں جزیرہ سسلی دیکھا، وہاں کا سمندر دیکھا، اس کی روشنیاں دیکھیں، وہاں کے ہنگامے دیکھے، غیروں کا عروج واقتدار دیکھا، پرانا زمانہ یاد آ گیا، کھوئی ہوئی روشنی پھر جھلملانے لگی، دل کو آنکھ بلکہ تاریخ کی آنکھ اس سسلی کو دیکھ رہی تھی جو کبھی جزیرۂ میقلیہ تھا، جہاں بیسیوں شہر، وہ بھی قابل صد فخر شہر آباد تھے (۴) جہاں کے قلعے کسی سے فتح نہ ہوتے تھے، جہاں مسلمانوں نے نئی تہذیب کی داغ بیل ڈالی جو سسلی یورپ وافریقہ دونوں کے لئے تمدنی سرمایہ تھا جو مسلمانوں کا دوسرا ہسپانیہ تھا جہاں مسلمانوں نے بلا مبالغہ پچیسیوں دفعہ چڑھائی کی، رومیوں نے جس کے دفاع کے لئے اپنی ساری توانائی جھونک دی جہاں مقدس تابعین کا، پھر بعد میں آنے والے بیشمار مجاہدین کا خون بہا (۵) اس سسلی کو جب شاعر مشرق نے دیکھا تو دل قابو میں نہ رہا سینۂ صد چاک میں دل ویسے بھی کہاں تھا جو کچھ دل کے نام پر سامان سوختہ تھا وہ بھی نظر سسلی کر آیا، درد جگر چشم تر سے لہولہو ٹپکنے لگا۔

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خون آب بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
مردہ عالم زندہ جن کی شورش تم سے ہوا

آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا
غلغلوں سے جن کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے
آہ اے سسلی سمندر کی تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے
کوسبک چشم مسافر پرترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام
تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم تیرا
چن لیا تقدیر نے وہ دن کہ تھا محرم تیرا
ہے تیرے آثار میں پوشیدہ اس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلادے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپادے مجھے
میں تیرا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا

خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

واقعہ یہ ہے کہ غیرت قومی ،احساس ملی، خودداری نفس، علوہمت، جوش عمل اور کردار سازی کی بلندی کو بیدار کرنے اور زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے تاریخ کا جیسا خوبصورت استعمال علامہ نے اپنی شاعری میں کیا ہے کسی اور شاعر کے حصہ میں یہ کمال نہیں آیا۔

## اسلامیت

علامہ اقبال ایک غیور اسلامی شاعر تھے اور اسلام کو اپنے تمام گوشوں کے ساتھ زندگی کے ہر مرحلہ میں جاری وساری دیکھنا چاہتے تھے جن لوگوں نے ان کے اشعار کا سطحی مطالعہ کر کے ان کو اشتراکیت سے داغدار کرنے کی کوشش کی وہ خود علامہ کے الفاظ سن لیں خواجہ غلام السیدین کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "شوسلزم کے ماننے والے مذہب اور روحانیت کے منکر ہیں یہ لوگ مذہب افیون سمجھتے ہیں سب سے پہلے جس شخص نے مذہب کو افیون کہا وہ کارل مارکس تھا میں ایک مسلمانوں ہوں اور انشاء اللہ مسلمان ہی رہوں گا(۶) زمیندار لاہور کے ایڈیٹر کے نام یوں لکھتے ہیں بلشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہوجانے کے مرادف ہے(۷) یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ علامہ بعض دفعہ سرمایہ دارانہ نظام کو رد کرنے کے جوش میں کبھی کبھی اشتراکیت کیساتھ کچھ دیر کے لئے کھڑے ہوتے نظر آتے ہیں لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ کھڑا ہونا اشتراکیت کی حمایت میں ہرگز نہیں تھا بلکہ یہ سرمایہ داری کی مخالفت میں تھا چونکہ سرمایہ داری کی سب سے شدید مخالفت اشتراکی خیمہ سے ہورہی تھی اس لئے وقتی طور پر اپنے اشعار میں ان کا ساتھ دینے کو علامہ نے

نامناسب نہیں سمجھا اور نہ اشتراکیت کو ایک فلسفہ حیات اور ضابطہ زندگی کے طور پر انہوں نے کبھی بھی قبول نہیں کیا رہا مسئلہ دہریت کا تو وہ ان کو چھو کر بھی نہیں گزری۔

## عشق رسول

عشق رسول علامہ اقبال کا سرمایہ حیات تھا اور ملت کی بیداری کے لئے علامہ کے نزدیک یہی تنہا آب حیات تھا عمر کے ابتدائی دور میں ۱۹۰۵ء بلکہ دور شباب میں جب آپ کا لندن جانا ہوا تو آپ کا جہاز عدن سے گزرا وہیں سے سرزمین عرب کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے یہ گو کہ نثر ہے لیکن تاثیر میں شعر سے بڑھ کر ہے

اے عرب کی مقدس سرزمین تجھ کو مبارک ہو تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک عظیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ وہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیرے کھجوروں کے سایہ نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو، کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں "بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی" (۸)

اسی محبت کے مارے دل سے بعد میں قدرت نے عشق رسول سے متعلق وہ اشعار کہلوائے جس نے ملت کا درد سمیٹا، اور قوم کو نیا حوصلہ نئی امنگ اور جینے کے لئے نئے ڈھنگ سکھائے حقیقت یہ ہے کہ جب تک حب رسول کا سرمایہ امت کے پاس

محفوظ ہے یہ امت کبھی مٹ نہیں سکتی اس سے امت کی آبرو یہی امت کے درد کا مداوا اور یہی دینی و دنیاوی ترقی کی اصل اور معراج ہے، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ زانوان حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہوں

ان کا یقین تھا کہ جذبہ عشق سے بالخصوص عشق رسول سے بڑے سے بڑا کارنامہ انجام پا سکتا ہے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

اس باب میں فارسی ذخیرہ اردو کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے اور موثر بھی ہے۔

## تصور مرد مومن

علامہ نے اپنی شاعری میں مرد مومن کا نہایت وسیع تصور پیش کیا، وہ مرد مومن کو کسی ایک خانے میں مقید دیکھنا نہیں چاہتے تھے، وہ تو حلقہ شام و سحر سے بھی اسے آزاد دیکھنا چاہتے تھے، ان کا فرمان تو یہ تھا۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقہ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

وہ مرد مومن میں آفاق کی وسعتوں کو گم دیکھنا چاہتے تھے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

گویا علامہ کے نزدیک مومن کی مکانی وسعت یہ ہے کہ سارے آفاق اس کی ذات میں گم ہوں زمانی وسعت کا عالم یہ ہے کہ حلقہ شام وسحر بھی اسے طوق غلامی محسوس ہو۔

وہ اپنے لئے ایک ایسا عالم چاہتا ہے جو زمان ومکان سے بھی ماورا ہو۔

نہ چینی وعربی وہ نہ رومی وشامی
سما سکا نہ دوعالم میں مرد آفاقی

اس کی غیرت وخودداری کا یہ عالم ہے کہ عظیم سے عظیم تر چیز کو بھی وہ قوت بازو کے بغیر حاصل کرنا پسند نہیں کرتا۔

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تیری پنہاں ہے میرے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

اس کی تاثیر کا عالم یہ ہے:

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس کی قوت وطاقت کی حیثیت یہ ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب وکارآفریں کار کشا کارساز
خاکی ونوری نہاد بندہ مولا صفات
ہردوجہاں سے غنی اسکا دل بے نیاز

خلاصہ یہ ہے کہ وہ اس سرزمین پر اللہ کا خلیفہ و نائب ہے، اس عالم کے تمام خزانوں کا مالک وہی تنہا ہے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

## نوجوان اسلام

علامہ اقبال کو اس کا شکوہ تھا کہ آج کا نوجوان اپنی میراث سے محروم ہو چکا ہے، اس کی میراث سے غیر فائدہ اٹھا رہے ہیں، شاعر مشرق کے نزدیک یہ میراث ایسی قابل قدر تھی کہ اس پر کل اسلامی تہذیب کا مدار تھا، حکومت بھی اس کے مقابل ہمیں ذرہ کمتر میں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

حکومت کا تو کیا رونا وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلمہ سے کوئی چارا

لیکن دل خراش حقیقت یہ ہے:

گنوادی ہے ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

وہ ملت کے ہر نوجوان کو صاحب میراث دیکھنا چاہتے تھے، کس قدر سوز و درد کے ساتھ انہوں نے غنی کشمیری کے اس شعر کو مستعار لے کر اپنی تڑپ ظاہر کی ہے،

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

اے غنی پیر کنعاں (حضرت یعقوب علیہ السلام) کی بدنصیبی ذرا دیکھو، اس کی آنکھوں کی روشنی، اس کے گھر کے چراغ، اس کے گوہر شب تاب اس کے نورِ نظر

نے زلیخا کی آنکھ روشن کر رکھی ہے، یعنی دئے ہمارے تھے گھر دوسروں کے روشن ہوئے، ستارے ہمارے تھے غیروں کے آسمان پر چمکے، آب حیات ہمارا تھا حیات جاوداں اغیار کو ملی۔

ہر قسم کے پھول ہم نے کھلائے، لیکن ان پھولوں کی مہک ہمارا نصیب نہ بن سکی، تہذیبی وراثت ہماری تھی لیکن دوسرے اسے لے اڑے ہمارے حصہ میں تیز رفتار قافلوں کا غبار ہی آیا۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا سیپارا

غرض علامہ اقبال کی شاعری کا کوئی باب کھولیں جس طرح چاہیں اس پڑھیں جس طرح چاہیں اس کا تجزیہ کریں نتیجہ حمیت دینی اور غیرت ملی کی شکل میں ظاہر ہوگا، ملت اسلامیہ کی تاریخ کے اس نازک ترین دور میں جب امت ہر طرف سے چھلنی کی جارہی تھی زار و نزار حالت میں سانس لے رہی تھی، بلکہ سانس گن رہی تھی، ایسی حالت میں ضرورت ایک ایسے شاعر کی تھی جو اس کے تن مردہ میں جان ڈال دے، اسے اسکا کھویا ہوا مقام واپس دلا دے یا کم سے کم اسے اپنی حیثیت ہی یاد دلا دے، علامہ کی بے مثال شاعری میں یہ کام انجام دیا، اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا، وہ بیسویں صدی کے مسلمانوں کے لئے قدرت کا انمول تحفہ تھے، اللہ کا انعام تھے، وہ شاعر مشرق سے بڑھ کر شاعر اسلام تھے، ملی غیرت اور حمیت دین کی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

---

(۱) اقبالیات، مولانا مودودی، از اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ ص ۵۸۔۵۹

(۲)اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۱۱۱

(۳)کلیات مکاتیب اقبال، سید مظفر حسین برنی، ص ۲۶ ۷

(۴) مراصہ الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والتباع، صفی الدین عبدالمومن بن عبدالحق ۲/ ۸۴۷۔۸۴۸

(۵) تفصیل کے لئے دیکھئے، الکامل فی التاریخ لابن الاثیر ۳/ ۱۱۸، ۱۹۹، ۴/ ۱۰۹، ۳۶۹، ۵۵۹، ۵۶۷، ۵/ ۱۴۶، ۱۷۴، ۱۸۵، ۱۹۱، ۳۱۳، ۴۵۶، ۶/ ۱۴۵، ۳۳۳، ۳۴۰، ۵۲۰، ۷/ ۶، ۱۰۔۶۳، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۲۰، ۱۲۵، ۲۱۷، ۲۴۹، ۲۸۴، ۳۲۰، ۳۳۴، ۳۶۱، ۳۷۰، ۳۹۸، ۴۱۷، ۴۲۱، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۲۰

(۶) مکتوب مورخہ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۳۷۔ از اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ پروفیسر عمر حیات خاں غوری ص/ ۱۶۴

(۷)اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ، پروفیسر عمر حیات خاں غوری ص/ ۱۶۴

(۸)از عدن، مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ سید مظفر حسین برنی ص/ ۱۰۶۔۱۰۷

عبدالرشید ندوی

# شاعر انقلاب اور نوجوان

## یعنی علامہ اقبال اور نئی نسل

دنیا جانتی ہے کہ اقبال ایک شاعر انقلاب تھے، ان کے نزدیک انقلاب ہی زندگی ہے، انقلاب ہی اقوام وامم کی بقاء وترقی کا ضامن ہے، جس زندگی میں جمود وتعطل ہو وہ موت کے مرادف ہے، اور جس قوم میں یہ روح نہ ہو وہ لاشۂ بے جان ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

ان کے نزدیک "جاوداں" پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی"، اور سکوت ٹھہراؤ کسی بھی شے کے حق میں اچھا نہیں ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ تغیر وتبدیلی اور ترقی چاہتا ہے، کاروان دہر ہر لحہ رواں دواں ہے، اس کو منزل میں نہیں سفر اور بادیہ پیمائی میں مزہ آتا ہے، تڑپنا پھڑکنا، الجھنا اور سلجھنا یہی شان فطرت ہے۔

فریب خطر ہے سکون وثبات تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروان وجود کہ ہر لحظہ تازہ ہے شان وجود
بہت اس نے دیکھیں ہیں پست وبلند سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

علامہ اقبال کے اس فکر انقلاب کا سوتا ان کے ایمان ویقین اور خلوص ومحبت سے ابلتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے ایمان ویقین کے بغیر کسی انقلاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بڑے مؤثر انداز میں فرماتے ہیں:

"دراصل علامہ اقبال کا یہی وہ ایمان کامل اور حب صادق تھی جس نے علامہ اقبال کے کلام میں یہ جوش، یہ ولولہ، یہ سوز وگداز پیدا کر دیا، اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ دراصل رقت انگیز شعر، عمیق فکر، روشن حکمت، بلند معنویت، نمایاں شجاعت، نادر شخصیت اور عبقریت کا حقیقی منبع وسرچشمہ محبت ویقین ہی ہے، اور تاریخ عالم میں جو کچھ بھی انسانی کمالات یا دائمی آثار ونشانات نظر آتے ہیں وہ سب کے سب اسی محبت ویقین کے مرہون منت ہیں، اگر کوئی شخصیت یقین ومحبت کے جذبہ سے خالی ہو پھر وہ صرف گوشت وپوست کی صورت ہے اور اگر پوری امت اس سے خالی ہے تو پھر اس کی وقعت بکریوں اور بھیڑوں کے گلے سے زیادہ نہیں، اور اسی طرح اگر کسی کلام میں یقین ومحبت کی روح کارفرماں نہیں ہے تو پھر وہ ایک مقفی اور موزون کلام تو ہو سکتا ہے، لیکن ایک

زندہ وجاوید کلام نہیں ہوسکتا سچ تو یہ ہے کہ محبت ویقین کے بغیر ادب وفن مردہ وافسردہ وناتمام ہے۔"

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

بہرحال اقبال کا انقلاب ایمانی انقلاب ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ بندہ مومن کی اذان ہی سے وہ سحر نمودار ہوتی ہے جس سے دیجور شب دور ہوتی ہے اور سوئی ہوئی انسانیت جاگ جاتی ہے، زندگی حرکت ونشاط سے لبریز ہوجاتی ہے۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

حضرات! اوروں کے نزدیک انقلاب کے کچھ بھی معنی ہوں لیکن شاعر مومن علیہ الرحمہ کے نزدیک انقلاب نام ہے ماضی کی عظمت رفتہ کو اپنے سامنے رکھنے، بگڑے ہوئے حال وماحول سے بیزار رہنے اور پھر مستقبل کو ماضی سے جوڑ کر صالح وبہتر، درخشاں وتاباں اور پرشکوہ وپرکشش بنانے کا، جو یہ کام انجام دے وہی میر کارواں اور امام زماں ہے۔

ہے وہی تیرے زمانہ کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں یعنی دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گر مادے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

مسلمان تعمیرنواورنشاۃ ثانیہ کے لئے وہی اصول ڈھونڈتے ہیں جو اسلاف نے چھوڑے ہیں، ماضی ہی ان کے مستقبل کی تعبیر ہوتا ہے، اسلام کے آئینہ ہی میں وہ اپنی زلفیں سنوارتے اور سلجھاتے ہیں۔

یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اسی دور نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

حضرات! اقبال رحمہ اللہ اگر انقلاب روح کے حامل تھے تو پھر وہ مسلم نوجواں کو کیسے نظرانداز کرسکتے تھے، جبکہ انقلاب اور شباب کا ساتھ چولی دامن کا سا ہے، تاریخ کے تمام صالح انقلابات کا سہرا نوجواں مومن ہی کے سر بندھتا ہے، یہ نوجواں ہی ہے کہ جب بادۂ ایمان ویقین سے سرشار وسرمست ہوتا ہے تو پھر نہ دربار سلطانی کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ تیغ وشمشیر سے خوف کھاتا ہے بلکہ وہ ایوان کفروباطل میں جرأت رندانہ کے ساتھ توحید کا نعرہ مستانہ لگاتا ہے:

"انهم فتية آمنو بربهم وزدنا هم هدى ور بطنا على قلوبهم اذ قامو فقالواربنا رب السموت والارض،لن ندعوأ من دونه الها لقد قلنا اذا شططا،هو لاء قومنا اتخذ وامن دونه آلهة،لولا ياتون عليهم بسلطان بين،فمن أظلم ممن افترى على الله كذبا" اقبال نے ایسے نوجواں کے لئے کہا ہے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

نوجوان ہی تو ہیں جن کے قلب حرارت و گرمی اور سینے جوش و خروش سے معمور ہوتے ہیں جن کی رگ و پے میں زندگی کا تازہ خون موجیں مارتا ہے، جن کی پیشانی سے عزم و حوصلے کے آثار ہویدا ہوتے ہیں، دشمنوں پر جھپٹنے میں انہیں وہ لذت ملتی ہے جو مالِ غنیمت پانے میں نہیں۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ایسے مرد جانباز کے علاوہ انقلاب کون لاسکتا ہے، مستقبل کا معمار اور کون ہوسکتا ہے، ملت کا مقدر اور کن سے سنور سکتا ہے، امت تاج سرداری کی حقدار تب ہی تو بن سکتی ہے جب اس کے جوانوں کی غیرت جوش میں آئے،

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سرداری
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

صہبا و صراحی کی لذت سے شاد کام وہی قوم ہوسکتی ہے جس کے نوجوانوں میں جفاکشی و سخت طلبی کی عادت ہو۔

گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستور قدیم

کہ نہیں میکدہ وساقی ومینا کو ثبات
قسمت بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا
آنکھیں جس کے جوانوں کو ہے تلخاب حیات

کیوں نہ آخر پھر علامہ اقبال کی توجہ ودلچسپی کا مرکز ومحور پاکیزہ نگاہ وپاک دل نوجوان ہو جس کی ہمت کی بلندی کے سامنے دشت ودریا زمین آسماں چاند تارے ہیچ ہوں جس کی جوانی پر کوئی داغ دھبہ نہ ہو، جس کی اندر تخت ونسوانیت کے بجائے طاقت وقوت اور مردانگی کا جوہر ہو، جو أشدا علی الکفار" اور "رحماء بینھم" کی بولتی تصویر اور علمی تفسیر ہو، یقیناً ایسے نوجواں کو ان کا محبوب وپیارا اور آنکھ کا تارا ہونا چاہئے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
وہی جواں ہے قبیلہ کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیران غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری

اقبال علیہ الرحمہ نے تاریخ پر گہری نگاہ ڈالی تو انہوں نے دیکھا کہ حضور انور صلی اللہ وسلم کے فیض تربیت سے جو جواں مرد تیار ہوئے، انہی کی بدولت چشم دنیا نے ایسا عظیم وصالح انقلاب دیکھا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ہے، مشہور خارجی خطیب ابوحمزہ شاری طہوفی ۱۳۰ھ نے اپنی ایک انتہائی بلیغ تقریر میں کہا تھا: "یا أھل مکۃ تعیرو ننی بأصحابی، تزعمون أنھم شباب وھل کان

أصحاب رسول الله۔صلی الله علیه وسلم۔الا شبانا،شباب والله مکتهلون،عمیة عن الشر أعینهم،بطیة عن البا طل أرجلهم"

علامہ اقبال آج کے نوجواں مسلم کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنے انہی اسلاف کونمونہ بنائے اوراپنی اس نسبت کی لاج رکھے،ان کے لئے وہ باعث ننگ وعارنہ ہو، کتنے سوز ودرد کے ساتھ وہ اس کی فکرکومہمیز کرتے ہیں

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوتا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سردارا
تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا
گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسمان نے ہم کو دے مارا

جب وہ دیکھتے ہیں کہ آج کا نوجواں مسلم تن آسانی وعیش پرستی کا دل دادہ ہو گیا ہے شمشیروسناں کے بجائے وہ طاؤس ورباب کا عاشق ہے،میدان کارزار کی آبلہ پائی کے بجائے وہ صوفوں اور قالینوں میں دادعیش دے رہا ہے،زورحیدری وفقر بوذر کو چھوڑ اس تہذیب جدید اوراس کے علمبرداروں کواپنا پیشوامان لیا ہے تو ان کی آنکھ خون کے آنسو بہاتی ہے،اورسوز جگر میں ڈوبا ہوا یہ نغمہ ان کی زبان سے نکلتا ہے۔

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری ہے تجھ میں نہ استغناء مسلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغناء میں معراج مسلمانی

علامہ اقبال رحمہ اللہ علیہ نے اپنے مثالی ومعیاری نوجوان کو عموماً شاہین وشہباز کا نام دیا ہے، کیوں کہ وہ اس میں جس طرح کے اعلیٰ اوصاف دیکھنے کے متمنی ہیں وہ انہیں پرندوں کی دنیا کے اس درویش میں نظر آتے ہیں۔اقبال نے خود ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ''شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، خوددار وغیرت مند ہے اور ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، بے تعلق ہے کہ آشیاں نہیں بناتا، بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے اور تیز نگاہ ہے۔

جب ایک مرد جواں میں عقابی روح بیدار ہوتی ہے تو پھر یہ عالم رنگ وبو اس کو تنگ نظر آتا ہے، یورپ پچھم کے حدود اس کو اپنی بلندی کے شایان شان نہیں معلوم ہوتے، وہ سلطان وقصہ سلطانی کا منت کش نہیں ہوتا ہے بلکہ بیابانوں اور پہاڑوں میں بسیرا کرنا اس کو اچھا لگتا ہے۔چنانچہ ڈاکٹر صاحب اس بلند ہمت پرندے کے توسط سے مرد مومن کو پیغام دیتے ہیں۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
قناعت نہ کر عالم رنگ وبو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہے

یہ یورپ یہ پچھم چکوروں کی دنیا
میرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

حضرات! اقبال کو بڑا رنج وافسوس ہوتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ شاہین زاغ وکرگس کے درمیان زندگی بسر کرنے، اور غلامی کی فضاء میں سانس لینے کی وجہ سے اپنے جوہر سے نا آشنا ہے، وہ اس سے نالاں بھی ہیں اور بے زار بھی۔

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہین بچہ کو صحبت زاغ
اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے یہ مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال ومقامات

اور اس کا ذمہ دار وہ مغربی طرز تعلیم وطریقہ تربیت کو قرار دیتے ہیں:

شکایت مجھے یارب خداوندان مکتب سے ہے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

لیکن ان سب کے باوجود اقبال یاس وقنوطیت کے شاعر نہیں، بلکہ ان کو اپنے رب کی رحمت پر پورا یقین ہے اور امت مسلم کی شادابی وسرسبزی اور سرو دم خیزی کی صلاحیت پر کامل اعتماد وبھروسہ ہے اگر اس زمین میں تھوڑا اور خون پسینہ بہایا جائے، اشک دیدہ وخون جگر ملایا جائے تو یہ مٹی پھر اپنی باغ وبہار لائے گی۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے باقی

اس کے لئے اقبال اپنے خدا کے حضور میں ہاتھ اٹھاتے ہیں آہ سحر گاہی میں اپنا دل وجگر نکال دیتے ہیں کہ یارب ان نوجواں کو پھر وہی ذوق وشوق اور سوز وگداز عطا کر پھران کو اسی جنوں سے آگاہ کردے جس کے سامنے خرد بہانے نہ تراش سکے پھران کو ایمان ویقین کی چاشنی چکھادے۔

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگاکر اُڑا
مری فاگ جگنو بناکر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دل مرتضی سوز صدیق دے
جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق مری نظر بخش دے
جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال وپر دے
خدایا آرزو مری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

---

مراجع: کلیات اقبال۔نقوش اقبال۔حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی۔اقبال سب کے لئے۔
فرمان فتحپوری۔اقبال عہد آفریں۔ اسلم انصاری

مولانا عبدالغفار ندوی

# علامہ اقبال کی اردو شاعری میں ملی احساسات کی ترجمانی''

حضرات! علامہ اقبال ایک شاعر بھی ہیں، مفکر بھی، حکیم وکلیم بھی، خودی کے پیغامبر بھی ہیں اور بے خودی کے رمز شناس بھی، وہ تہذیب وتمدن کے نقاد بھی ہیں محی الملت والدین بھی، وہ توقیر آدم کے مبلغ بھی ہیں، ملی احساسات وجذبات کے ترجمان بھی، قومی مذہبی عظمتوں کے خواہاں بھی، غرض ان کی شخصیت ایک ہمہ گیر وہمہ جہت ہے، جن کو محض شاعر گمان نہیں کیا جاسکتا، بقول خلیفہ عبدالحکیم ''شاعری کو عام طور پر لطف طبع کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، اس کو اعمال حسنہ میں شمار نہیں کیا جاتا، زیادہ تر شاعری ہوتی بھی ایسی ہی ہے لیکن شاعری کی ایک قسم وہ بھی ہے جو کر تو توں کو ابھارتی ہے خستگان حیات کے دل کو قوی کرتی ہے'' انگریزی شاعر ٹینی نے بجا فرمایا ہے: ''جس شاعری سے ملت کا دل قوی ہو، اس کی ہمتیں بلند ہوں، اس کو اعلیٰ درجہ کے اعمال حسنہ میں شمار کرنا چاہئے! چنانچہ اقبال کی شاعری کا شمار اسی قبیل میں ہوتا ہے'' ملی احساسات کی ترجمانی، بلند حوصلگی، محبت وایمان، اسلام کی عظمت رفتہ، مسلمانوں کے اقبال گزشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکرمندی ان کی شاعری

میں جھلکتی ہے، وہ تنگ نظر، قومیت ووطنیت سے گریز کرنے والے انسانیت واسلامیت کے سب سے بڑے داعی دکھائی دیتے ہیں، وہ ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کو نا قابل تسخیر قلعہ ان کی قوت وطاقت کو خرق عادت دیکھنا چاہتے ہیں۔

قدرت نے چونکہ شاعر کو ایک دردمند دل احساس دماغ دیا تھا، اس لئے انہوں نے اپنی شاعری کا مخاطب اس قوم کو بنایا ہے جن کا دل صدیوں سے غلامی نے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ جو زخم خوردہ و پسپا ہو رہی تھی، جن میں کہنگی وفرسودگی، پژمردگی وافسردگی پیدا ہو چکی تھی۔ شاعر نے ایسوں کے اندر ملی احساس، دینی حمیت وغیرت، قومی رفعت پیدا کرنا چاہا ہے کہ وہ اپنی عظمت رفتہ واقبال گزشتہ کو بحال کریں۔ (فکر اقبال ص۲)

ذلت وپستی، غلامانہ ذہنیت ان کا پیشہ نہیں، بلکہ سیادت وقیادت، امامت وسربراہی ان کا مقام ہے۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر، شجاعت وبہادری، جواں مردی وسپہ گری ان کا شعار ہے۔

چنانچہ ان کی شاعری میں اگر آپ تلاش کریں تو آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ان کا اعتقاد ہے کہ مسلمان ہی اس عالم رنگ وبو میں گل سرسبد ووجہ تخلیق آدم ہے، اسی کے رنگ سے اس کائنات میں رنگ ہے۔ خلاصہ یہ کہ بندۂ مومن ہی حاصل کائنات ہے، وہ تمثیل کی زبان میں مسلمان کو شہباز یا شاہین بتلاتے ہیں کہ اس کی پرواز بہت بلند اور اس کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں

دوسری جگہ کہتے ہیں:

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

حضرات! اقبال کا فلسفہ حیات رجائی ہے وہ دنیا والوں کے لئے امید کے پیغام رساں ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یاس انگیزی جب ایک حد تک پہنچ جاتی ہے تو اقبال بیک وقت چونک اٹھتے ہیں کہ میں نے اپنے اوپر کیا غلط جذبہ طاری کرلیا ہے، فنا تو زندگی کی ماہیت نہیں ہوسکتی، اور قدیم اقوام کے زوال پر نظر ڈالتے ہوئے ملت مسلمہ کی طرف آتے ہیں تو یہ یوں گویا ہوتے ہیں۔

آہ مسلم بھی زمانہ سے رخصت ہوا
آسماں سے ابر آزادی اٹھا برسا کیا

اس کے بعد یک دم فطرت کی حیات انگیزی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو کہیں فنائے محض نظر نہیں آتی، تمام فطرت نشاط آباد دکھائی دیتی ہے۔ لیکن پھر ہوک سینے میں اٹھتی ہے کہ فطرت کی نشاط انگیزی اس غم کا علاج تو نہیں ہوسکتی جو زوال ملت سے طبیعت کو غم کدہ بنا رہا ہے۔

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غم ملت ہمیشہ تازہ ہے

دو چار اشعار میں پھر یہ غم، نشاط فطرت پر غالب آجاتا ہے، لیکن آخری مرحلہ میں یاس و حسرت امید کو جنم دیتی ہے۔

دیر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کے آغوش میں

برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیٔ گل خاک صحراء کو بنا سکتا ہے یہ
خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

اقبال مایوس کن مشاہدات وتجربات کے باوجود ملت اسلامیہ سے کبھی نا امید نہیں ہوئے بلکہ اس کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے پیش نظر کہتے ہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

حضرات! اقبال کا یقین ہے کہ مومن خدائے لم یزل ولایزال کا رازداں اور ناموس ازل کا پاسباں اور اس کا دست قدرت ہے۔ اسی سے اس عالم کا بقاء و وجود متعلق ہے۔ اللہ کی مشیت وقدرت اور قوت کا ہر ہمیشہ اسی کے ساتھ رہتی ہے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ پہاڑ روک سکتے ہیں اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں اقبال اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں کارکشاں وکارساز
خاکی ونوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

یہی نہیں بلکہ وہ دنیا کی کامیابی وکامرانی کا راز صالح انقلاب کو سمجھتے ہیں، اور صالح انقلاب ہمیشہ مرد مومن، سچے عاشقان رسول، مجاہدین ملت کا مرہون منت رہا ہے، جنہوں نے دنیا کے اس مردہ لاشہ میں جان ڈال دی ہے جو زندگی کی تاریک راتوں کے لئے صبح صادق کا مؤذن ثابت ہوئے ہیں، جن کی اذان کی

آواز نے عالم کے سکوت کو توڑ دیا جو اپنے اندر رات کی سی خوفناک خاموشی، موت کا سا بھیانک سناٹا رکھتا تھا۔ اور یہی وہ اذان و بلند پکار ہے جو تیرہ، چودہ سو برس قبل فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوئی تھی، جس نے وسیع و عریض کائنات کو گہری نیند سے بیدار کیا تھا جو آج بھی اپنے اندر انسانیت کو جگانے، ضمیر انسانی کو زندہ کرنے کی وہی قوت و طاقت رکھتی ہے، ضرورت صرف ایسے مردِ مومن خود آگاہ کی ہے جو روح بلالی سے پکارے۔

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذان ندائے آفاق

اقبال کا عقیدہ و ایمان ہے کہ ایک مومن ہوا کے رخ پر نہیں چلتا بلکہ وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ ہوا کے رخ کو موڑ دے اور ساری انسانیت اس کے عمل و ارادہ کے تابع ہو جائے۔ اس لئے کہ صرف وہی اپنے پاس اس دکھی انسانیت کے لئے پیغام و پیام رکھتا ہے۔ دنیا کی امامت و قیادت اسی کو زیب دیتی ہے۔ اس عالم میں وہ صاحب امر و نہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر زمانہ اسے قبول نہ کرے، سماج اس کا مخالف اور سیدھی راہوں سے ہٹا ہوا ہو تو اس کے لئے کسی طرح صحیح نہیں کہ وہ زمانہ کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اپنے کو غلط سماج کے سپرد کر دے بلکہ اس پر ضروری ہے کہ زمانہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے معاشرہ و سماج سے جنگ کرے اور فاسد قدروں سے نبرد آزمائی کرے چاہے اس سلسلہ میں اسے تخریب ہی سے کام لینا پڑے چنانچہ کہتے ہیں:

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین وآسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اسی لئے وہ مومن کو جغرافیائی حدود وقیود سے بالا گردانتے ہیں کہ اس کا کوئی وطن نہیں بلکہ سارا عالم مشرق ومغرب اس کا ملک ووطن ہے، کائنات جب خدا کی ہے اور مومن صرف خدا کا ہے تو ساری دنیا مومن کی ہے۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

ہاں! شرط لازم ہے مومن کامل اللہ کی صفات کا مظہر ہو کشادہ قلبی عفوودرگزر میں خدا کی صفت غفاری کا پرتو ہو، کفر وباطل پر غیظ وغضب میں صفت قہاری کا مظہر ہو، پاکی وپاک دامنی، پاک نفسی وپاک بازی میں صفت قدوس کا آئینہ دار ہو،

قہاری و غفاری، قدوسی، و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

پھر اگر مرد مومن نے اپنے کو ان صفات کا حامل بنالیا تو اس کی مثال روشن آفتاب کی سی ہے جسے غروب نہیں، جو ہمیشہ طلوع ہو کر چمکتا اور دنیا کو فیضیاب کرتا رہتا ہے، اگر ایک طرف غروب بھی ہوتا ہے تو دوسری طرف طلوع ہو جاتا ہے، تاریخ کے صفحات آج بھی اس کی شہادت دے رہے ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اسلام کا آفتاب ایک افق پر چھپتا ہے تو دوسرے افق سے اس کی کرنیں نمودار ہوتی ہیں، اور ایسا اس لئے کہ اسلام ہی اللہ کا وہ آخری پیغام ہے جو ساری

انسانیت کے لئے شمع ہدایت ہے اس کے بعد اب اس عالم کے لئے کوئی دوسرا پیغام نہیں، اور مسلمان اس پیغام کی حامل آخری امت ہے اگر یہ ہلاک وضائع ہوگئی تو پھر آخری پیغام ضائع ہوجائے گا اور انسانیت کی کشتی ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے گی۔

اسی لئے نظامہائے باطلہ ودشمنان اسلام ہمیشہ اسلام ہی کو اپنے لئے خطرہ گردانتے رہے ہیں اور سارے نظامہائے باطل اور فرزندان ابلیس اسلام کی بقا وترقی اور اس کی سربلندی اس کے عروج واقبال کو اپنے لئے موت سمجھتے رہے ہیں۔

چنانچہ اقبال نے اپنی بے مثال نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس حقیقت کی خوب نشاندہی کی ہے انہوں نے تمثیلی انداز میں یہ بات واضح کردی ہے کہ آج ابلیسی نظام کو سارا خطرہ وخوف اسلام سے ہی ہے۔

فرماتے ہیں:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

لیکن جب ان کی نگاہ حقیقت شناس کفر وباطل کو اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی دیکھتی ہے تو اسے دیدۂ عبرت سے دیکھ کر خون کے آنسو روتے ہیں اور توحید کے علمبرداروں کی غیرت پر ضرب کاری لگا کر جھنجھوڑتے ہیں ان کی دینی حمیت کو جگاتے ہیں کہ تمہارے پاس تو وہ کلام ساحر ہے جس سے تم دلوں کو موہ لیا کرتے تھے، عمل قاہر ہے جس سے تم سرکشوں کو مسخر کرلیا کرتے تھے، تمہاری نگاہ تو مردِ افگن وصاعقہ فن ہے۔ آج تمہیں کیا ہوا تم نے اغیار کی غلامی اختیار کر کے اپنی خصوصیات وامتیازات سے ہاتھ کیوں دھولیا، دوسروں کی غلامی ونقالی کی وجہ سے جذبہ اندروں اور سوز دروں سے کیوں خالی ہوگئے، دل شکستہ ہوکر اقبال گزشتہ کی بحالی پر ابھارتے

ہوئے کہتے ہیں کہ

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہیں تجھ میں
گفتار دلبرانہ کردار قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبہ قلندرانہ

دوسری جگہ بڑی حسرت آمیز انداز میں کہتے ہیں کہ مرد مومن کا سجدۂ شوق جس سے روح زمیں وجد میں جھوم اٹھتی تھی منبر و محراب مدت سے اسی سجدے کو تڑپ رہے ہیں۔

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذان میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو ریشۂ سیماب

حضرات اقبال نے مغربی تہذیب و تمدن کو بہت قریب سے دیکھا تھا بلکہ اسی میں پروان چڑھے تھے اسی لئے جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی نئی نسل اسی تہذیب کی دل دادہ ہو رہی ہے جس کی اساس ہی دین و اخلاق کی دائمی دشمنی پر ہے، ہر زمان میں مادیت کے بت کدے میں نئے بت تراشنا جس کا محبوب مشغلہ ہے، دین و دنیا کی علیٰحدگی کے تصور نے جس کی وحدت ختم کر دی ہے۔

جس کی عقل باریک مگر روح تاریک ہے، جس کی عقل روشن مگر بصیرت اندھی ہے، جس کی تہذیب میں عقل پروان چڑھی ہے لیکن محبت اور انسانی جذبات اسی حساب سے مرجھاتے اور دم توڑتے رہتے ہیں، جس کے قائدین بنی آدم کے

خون پیتے ہیں، اور اسٹیج پر آکر انسانی مساوات اور عدالت اجتماعی کی تعلیم دیتے ہیں، بیکاری، عریانی، مے نوشی اور افلاس ہی فرنگی مدنیت کی سرفہرست فتوحات وکارنامے ہیں کہتے ہیں:

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی، میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

اور مسلمان قوم اس کی دلدادہ ہی نہیں بلکہ اسی پر فریفتہ ہوکر اسلام کی صاف وشفاف، پاکیزہ وطاہر تعلیمات سے روگردانی کررہے ہیں، اور اپنے مسائل کے حل کی امید مغربی طاقتوں یہودیوں سے رکھتے ہیں خاص طور سے مسئلہ فلسطین جن پر انہوں نے غاصبانہ قبضہ کیا ہے تو حساس شاعر کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے اور وہ تڑپ اٹھتا ہے اور خاص طور سے امرائے عرب سے اپنی جرأت گفتار کی معذرت کرتے ہوئے کہتا ہے تم دین کے اصلی حقیقت شناس ومخاطب ہو اور تم جانتے ہو کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب بولہب سے انقطاع ہی پر منحصر ہے، ایمان وکفر، ظلمت وروشنی، الحاد ودہریت، اور اسلام کی عمدہ تعلیمات ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں، اسلام کہاں اور قومیت ووطنیت اور مادی فلسفے کجا، نیز عالم عربی سرحدوں وسرزمینوں وپہاڑوں وپتھروں، دریاؤں وسمندروں، انسانی آبادی سے معمور اور جغرافیائی حدود سے گھرے ہوئے علاقہ کا نام نہیں، بلکہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے سچے وحقیقی انتساب اور ان کے دین سے گہرے تعلق ان کی تعلیمات ہی میں دنیا وآخرت کی فلاح وکامرانی، سرخروئی وسرفرازی، عزت وشرافت کے مضمر سمجھنے کا

نام ہے۔ کہتے ہیں:۔

کرے یہ کافر ہندی جرأت گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو
وصال مصطفوی ہے افتراق بولہبی
نہی وجود حدودو ثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

تم تو وہ ہو جن کے اسلاف، آباء واجداد نبوت کے شاہکار، نوع انسانی کے لئے شرف وافتخار کا باعث تھے جن کا پختہ یقین گہرا علم، سچا دل، بے تکلف زندگی، بے نفسی وخدا ترسی، پاکی وپاکیزگی، شفقت ورافت، شجاعت وجلالت، ذوق عبادت، شوق شہادت، شہسواری وشب زندہ داری، سیم وزر سے بے پرواہی، دنیا سے بے رغبتی، عدل اور حسن انتظام دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، تم کیوں ان کی طرف للچائی ہوئی اور مرعوبیت کی نگاہ سے دیکھتے ہو تمہیں تو صداقت وعدالت، شجاعت وجوانمردی کا سبق پڑھ کر دنیا کی امامت وقیادت کا فریضہ انجام دینا چاہئے تھا۔

فرماتے ہیں:۔

خاکی ونوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہہ دل نواز

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تم سے کام دنیا کی امامت کا

خلاصۂ کلام یہ کہ اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ بلکہ صحیح لفظوں میں پوری شاعری ملی احساسات کی ترجمانی، قومی ترقی کی نشان، دینی شعور اور وجدان کی بیداری کی داعی، تقلید اغیار سے متنفر، مومنانہ حکمت وفراست کی آئینہ دار، ہمت مردانہ کی علمبردار ہے، ملت کی حمیت اسلامی وغیرت ایمانی کو چھیڑ کر جوش وولولہ پیدا کرتی ہے، اور ساز محبت کو چھیڑ کر سوز وگداز پیدا کر دیتی ہے، اور قوم میں خود اعتمادی وخودداری کو جگاتی ہے، ذلت وپستی، رسوائی وکاسہ لیسی سے نفرت پیدا کرتی ہے یہ عرفان نفسی وخودی، وخودداری، عرفان ملی وقومی اور ذاتی شخصیت کی تعمیر کا جذبہ پیدا کرتی ہے اخلاص وللّٰہیت، خدا طلبی، خودشناسی وخداشناسی کا داعیہ پیدا کرتی ہے۔ الوالعزمی، مہم جوئی، سمندروں ودریاؤں سے کھیلنے، پہاڑوں سے ٹکرانے کی ہمت عطا کرتی ہے وہ خود کہتے ہیں:۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے سچ فرمایا ہے: ''اقبال کا کلام ہمارے شعور واحساس قلب ووجدان، اور اعصاب میں حرکت وحرارت، سوز وگداز، درد وتپش پیدا کرتا ہے، پھر ایک شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اٹھتا ہے جس کی گرمی سے مادیت کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں، فاسد معاشرہ اور باطل قدروں کے ڈھیر جل کر فنا ہو جاتے ہیں، جن سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کس قدر طاقتور ایمان پرور وپرسوز سینہ، اور بے چین روح رکھتا ہے۔'' (نقوش اقبال ص ۹۰)

معاذ احمد کاندھلوی

# مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی

## اور مثنوی گلزار ابراہیم

یہ بات کہی جاتی ہے کہ اردو زبان کو وسعت وعمومیت تحریک شہیدین یعنی حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید سے حاصل ہوئی، اس تحریک نے اپنا پیغام پہنچانے کے لئے اردو زبان کو اختیار کیا، اور ۱۹ویں صدی عیسوی کے اوائل میں متحدہ و مستحکم ہندوستان کے چپہ چپہ میں اس کے افراد نے پھیل کر اس زبان کو ایک بڑا مقام دلایا، اس تحریک سے مشہور شاعر حکیم مومن خاں مومن وابستہ ہوگئے تھے پھر دوسرے اہل درد شاعر بھی اس سے جڑتے چلے گئے، انہی میں ایک مردم خیز اور تاریخ ساز قصبہ ''کاندھلہ'' ضلع مظفر نگر کے مولانا ابوالحسن کاندھلوی بھی تھے۔ جو حسن تخلص کرتے تھے، اور تحریک شہیدین کے ایک ممتاز فرد اور خاتم مثنوی مولانا روم بحرالعلوم مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے فرزند ارجمند اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے مسترشد ارشد تھے۔

کاندھلہ کا یہ خانوادۂ صدیقان جس سے وہ نسبی تعلق رکھتے تھے، قاضی ضیاء الدین سنامیؒ کی اولاد میں ہے، حضرت قاضی ضیاء الدین سنامیؒ اپنی دینی

اصابت وصلابت اور اتباع سنت میں نادرۂ روزگار، احکام شریعت کی حرف بہ حرف پاسداری میں فخر امثال واقران، اور شریعت کی معمولی خلاف ورزی اور طریق سنت سے سرمو انحراف کی صورت میں بڑے بڑوں کو سرِ مجلس بلا تامل تنبیہ ونصیحت کرنے میں نہ صرف اپنے زمانہ میں بلکہ تاریخ اسلام کی نادر شخصیات میں سے ایک ہیں، یہاں تک کہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ جیسے اکابر کو بھی برملا تنبیہ فرمادیتے تھے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے دیسنہ کے ایک مخطوطہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کی پشت پر یہ شعر لکھا ہوا دیکھا ہے۔

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے

بابائے اردو کی رائے ہے کہ یہ اردو کا قدیم ترین معلوم شعر ہے، شاہ ابواسحاق قادری لاہوری نے جو اکبر بادشاہ کے معاصر تھے اس شعر کو حضرت قاضی ضیاءالدین سنامیؒ کی طرف منسوب کیا ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے سب سے پہلے شاعر قاضی ضیاء الدین سنامیؒ ہیں، جن کی نسل میں آگے چل کر زیر نظر مقالہ کی موضوع شخصیت مولانا ابوالحسن حسن ہوئے۔

حضرت قاضی ضیاءالدین سنامیؒ کے دادا شیخ عوض بن ابوجعفر محمد، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے حقیقی بھائی اور شیخ ابوجعفر محمد قاضی بغداد کے بیٹے تھے، چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں وارد ہندوستان ہوئے اور شاہی ملازمت سے وابستہ ہوکر ترقی کرتے ہوئے بلند ترین عہدوں پر فائز ہوئے، یہاں تک کہ موصوف کے بیٹے محمد بن عوض۔معزالدین بہرام کے عہد حکومت (۶۳۷ تا ۶۳۹ھ) میں پورے

ملک کے مستوفی یعنی آڈیٹر جنرل Auditor General کے اعلا ترین منصب پر فائز تھے۔

زیر نظر مقالہ کی موضوع شخصیت مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی جس عظیم باپ کے زیر تربیت پروان چڑھے اس کو مبدء فیاض سے منجملہ اور کمالات ومحاسن کے ادب کا ذوق لطیف بھی عطا ہوا تھا، والد ماجد خاتم مثنوی مولانا روم بحر العلوم مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نہایت موزوں طبع، اور قادر الکلام شاعر تھے، اور نشاط تخلص کرتے تھے، طبیعت ایسی پر بہار ورواں تھی کہ ہر صنف سخن میں ہر وقت اپنی رعنائی اور کمالات کا نظارہ کراتی رہتی تھی، غزل، نظم، قطعہ، رباعی، قصیدہ، مرثیے، ہر موضوع پر مشق سخن کی، اور اعلیٰ درجہ کا ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا، فارسی اور اردو کی طرح عربی ادب میں نثر نویسی وشعر کا ذوق اسی معیار کا پایا ہے، ممتاز معاصرین اور تذکرہ نگار اس کمال فن کے معترف ہیں۔

اسی نادرۂ روزگار عبقری شخصیت کے یہاں تقریباً ۱۲۰۰ھ میں مولانا ابوالحسن کی ولادت ہوئی، ہر نوع کے کمالات ظاہری وباطنی والد ماجدؒ سے حاصل کئے، تعلیم کے بعد میرٹھ میں منصرم بندوبست مقرر ہوئے، لیکن والد ماجد کی وفات کے بعد وطن واپس آگئے، اور گھر پر تدریس کا سلسلہ جاری کیا، صرف اکبر سے صحیح بخاری تک ۱۶ رفنون کی ۶۷ کتابیں نصاب میں شامل تھیں، طب کا نصاب اس کے علاوہ تھا، بعض کتابوں کے سال میں کئی کئی دور ہو جاتے تھے، جس سے طلباء کی کثرت اور درس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، درس وتدریس سے فارغ وقت عبادت میں صرف ہوتا، سال میں دو ماہ شروع شعبان سے آخر رمضان تک مسجد میں معتکف رہتے۔

تذکرہ نگاروں نے مولانا ابوالحسن کے حسن اخلاق ورخوش مزاجی کی تعریف

کی ہے، مبتلا میرٹھی نے طبقات سخن میں مولانا کا حسب ذیل الفاظ میں تعارف کرایا ہے:

''ابوالحسن حسن، جوان خوبرو، وخوش خو، ورنگین طبع، میر محمد خاں سرور نے عمدہ منتخبہ میں اور کریم الدین پانی پتی نے طبقات شعراء ہند میں مولانا کی خوش خلقی کا ذکر کیا ہے۔

مولانا ابوالحسن خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے، اشعار شستہ اور فصیح ومتین ہوتے تھے، منظوم ترجمہ مثنوی مولانا روم، متعدد عارفانہ مثنویات، متعدد قصیدے، اور ایک رسالہ جہادیہ ان کی یادگار ہے۔

مولانا نے اپنی شاعرانہ صلاحیت، سیدھے سادے کلام اور پرتاثیر مثنویوں سے جو کام لیا اور اس کے ذریعہ عشق الٰہی کی جو چنگاری روشن کی اس سے بے شمار اہل دل کے سینے منور ہوئے، اور بہت سی سعید روحوں کو من کی دنیا کی طرف رہنمائی ہوئی، اس حیثیت سے ان کے کلام اور مثنویوں کی اہمیت بلند پایہ شعری مجموعوں اور ادبی نوشتوں سے بہت بلند ہے۔

مولانا کی طبع زاد مثنویوں میں پہلی مثنوی بحرالحقیقت ہے، بحرالحقیقت بڑی پرتاثیر اور عارفانہ مثنوی ہے، اس میں مثنوی مولانا روم کے طرز پر تمثیلی حکایتوں کے ذریعہ انسان کو مقصد زندگی یاد دلایا گیا ہے۔

مولانا کی مشہور ترین مثنوی ''مثنوی گلزار ابراہیم ہے۔ اس مثنوی کو مصنف نے مثنوی بحرالحقیقت کا دفتر ثانی قرار دیا ہے، تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار کی یہ مثنوی ۱۲۵۱ھ میں لکھی گئی، اس میں حضرت ابراہیم بن ادہم کا مشہور زمانہ واقعہ نظم کیا گیا ہے، حضرت ابراہیم کے والد ماجد حضرت ادہم کے بلخ کی شہزادی پر

عاشق ہونے کی داستان سے مثنوی شروع ہوتی ہے، اس واردات محبت کی مفصل سرگزشت پھر اس فقیر بے نوا ادہم کا بادشاہ بلخ ہونا، ان کے بیٹے ابراہیم کی پیدائش پھر ابراہیم کی تخت نشینی اور آخر میں ان کے تخت وتاج چھوڑ کر جذب ومعرفت کی دنیا میں گم ہوجانے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مصنف نے مزے لے لے کر یہ فسانۂ محبت دہرایا ہے، وہ اس کہانی کو بیان کرتے ہوئے ڈوب ڈوب کر ابھرتے ہیں، اور ہر مرتبہ عرفان الٰہی اور حق شناسی کے درنایاب لے کر آتے ہیں، چھوٹی چھوٹی بظاہر بے حقیقت باتوں سے عجیب نتائج اخذ کرتے ہیں، اور اس قصہ کے ایک ایک جزو میں معرفت کا سبق اور عشق ومحبت کی چاشنی تلاش کر لیتے ہیں، یہی درس عشق قصہ ابراہیم سے رب ابراہیم کی طرف لے جاتا ہے، یہاں پہنچ کر قاری مادی چیزوں کی بے ثباتی وبے وقعتی اور عشق الٰہی کی خاص کیفیت محسوس کرتا ہے، اور یہی اس مثنوی کا خاص مقصد ہے، اس مثنوی کے ذریعہ بہت سے اہل حق معرفت کے کوچہ سے روشناس ہوئے اور سینکڑوں اشخاص کو علم باطن کی دولت ملی، گلزار ابراہیم، کے اس خاص وصف کا اکابر علماء اور ممتاز مشائخ نے برملا اعتراف کیا ہے، حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے! مجھے اس طریق معرفت وسلوک کا ذوق اسی مثنوی سے پیدا ہوا۔

مثنوی گلزار ابراہیم مصنف کی حیات میں کئی بار شائع ہوئی اور آج تک برابر چھپ رہی ہے، اس کے بے شمار ایڈیشن نکلے اور ہاتھوں ہاتھ لئے گئے سینکڑوں قلمی نقلیں تیار ہوئیں اور ملک میں پھیل گئیں، ہندو پاک اور یورپ کے متعدد کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

مولانا ابوالحسن صاحب اس مثنوی کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کرتے ہیں۔

حمد بیحد اس خدائے پاک کو مرتبے جس نے دیئے ہیں خاک کو
حمد ہے اس مالک جبار کو رزق جو دیتا ہے ہر جاندار کو
حمد کرنا کب ہے مقدور بشر کرتے ہیں کچھ کچھ عبادت جان کر

اسی حمد میں اس خلاق عالم کی صنعت گری کا ذکر کچھ اس طرح چھیڑ دیتے ہیں:

کرتا ہے جو جوکہ تو گلکاریاں عقل بندے کی کہاں پہنچے وہاں
خاک سے پیدا کرے زیبندہ گل تاک سے ظاہر کرے جوشندہ مل
آب سے ظاہر کرے رخشان گہر قطرۂ ناپاک سے پیدا بشر
آگ سے پیدا سمندر کو کرے طعمۂ جاندار اخگر کو کرے

اسی روانی میں یہ شعر کہتے ہیں۔

ختم تجھ پر ہوگئی صنعت گری
ہے ہر اک برتر سے تجھ کو برتری

لیکن پھر ایک دم سنبھلتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ بھی توحید کے منافی ہے۔

یہ معاذ اللہ میں نے کیا کہا ہوگئی مجھ سے بڑی فاحش خطا
برتری کس کو ہے اس کے سامنے بہتری کرنیکا دعویٰ ہے کسے
بہتری وبرتری ہے سب عیاں اس کے آگے ذکر اس کا ہے کہاں
برتروں کا چاک ہوتا ہے جگر آب زہرہ مہتروں کا سربسر
ہے یہاں جو برترین برتراں کمترین کمتراں ہے وہ وہاں
زور میں ہے جن کا آوازہ بلند اس کے آگے ہیں ذلیل ومستمند
چرخ باایں عظمت وباآب وتاب ہے ترے دریائے قدرت کا حباب

آگے بڑی سادگی سے اپنے عجز وقصور کا اعتراف کرتے ہیں۔

ترے لائق گو نہیں میری ثنا میں عبودیت کو لاتا ہوں بجا
تو بھی میری حمد کو مقبول کر کرنہ عیب و نقص پر اس کے نظر
تو نے خود پیدا کیا ہم کو ضعیف ہوے ناقص تحفۂ مرد نحیف
کی زباں کو تو نے گویائی عطا ہو سکے کیا اس سے پھر تیری ثنا
میں سخن داں تو سخن پیدا کرے میں زباں داں تو دہن پیدا کرے
میں ثنا گو اور تو نطق آفریں میں بشر ہوں تو ہے رب العالمیں
ہے زباں اک پارۂ لحم وعصب حمد اے خالق بیاں ہو اس سے کب
اس زباں سے تیرا نام پاک لوں لخت میں گستاخ ہوں بیباک ہوں
آب کوثر سے اگر دھوؤں اسے تو بھی یہ لائق نہ ہو اس کام کے

نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شروع کرتے ہیں تو گویا عشق نبی میں ڈوب جاتے ہیں۔

بہترین اولین وآخریں فخر جملہ انبیاء ومرسلیں
گر نہ پیدا ہوتی اس کی ذات پاک تو نہ بنتے بادونار وآب وخاک
باعث ایجاد عالم ہے وہی علت نمائی آدم ہے وہی
امی واستاد جبرئیل امیں ناسخ احکام شرع ما بقیں
نام اس کا ہے دوائے ہر بلا احمد مرسل محمد مصطفیٰ
دمبدم اس پر درود وصد سلام پہنچے اس عاجز کا تحفہ بالدوام

اس بے حقیقت دنیا کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں تو کچھ اس طرح گویا ہوتے ہیں:

یہ زمین وآسماں ہے آسیا بیچ میں جو ان کے آیا سو پسا

دانہ خردل ہے یہ خلقت تمام ان کو دلتا ہے یہ ظالم صبح وشام
آسیا میں دانوں کو راحت کہاں عیش وعشرت خندہ وفرحت کہاں
اس لئے جودل ہے غم سے چاک ہے نیم بسمل بستۂ فتراک ہے
مال ودولت ہو زیادہ جس قدر ہو تجھے اتنا ہی زائد درد سر
مال وملک ودولت وجان وجلال جس قدر بڑھتے ہیں بڑھتا ہے ملال

طبقۂ علماء کی اہل ثروت کے در پر حاضری کی صورت میں عوام کو متنبہ کرتے ہیں اور ایسے علماء سوء سے محتاط ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔

کاہ کو آتش ہے لازم ہے حذر
ورنہ جل کر خاک ہو وہ سر بسر

اس لئے فرماتے ہیں:

خیرالوریٰ عالموں کو جانو تم شمس الضحیٰ

گر امیروں سے کریں وہ اختلاط تم کو پھر لازم ہے ان سے احتیاط
اہل حشمت پاس عالم جائے گر خائن اس کو سمجھو سر بسر
اختلاط اہل ثروت ہے بجا ان سے جو کوئی ملا خائن ہوا

آگے بندگان حق کی پہچان بتاتے ہیں:

بندگان حق ہیں مسکین وغریب کبر سے دور اور ذلت سے قریب
عجز وغربت ہی وہاں منظور ہے کبر ہے جس میں سو حق سے دور ہے

اس مقام پر پہنچ کر نکتہ آفرینی کرتے ہیں:

پک کے گر پڑتا ہے میوہ خاک پر
خام ہے جب تک رہے افلاک پر

اسی مثنوی میں حکمت ودانائی کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ابتدا میں سوچنا ہے سود مند حرف بیجا سے کرا دل لب کو بند
دل میں کر تجویز پھر کر لب کووا تاوباں جان نہ ہو تیرا کہا
ہے زباں تیری کلید قفل دل وہ نہ کہہ تا حشر میں ہو منفعل
توڑنا شیشہ ہے سہل اے خوشخصال لیک پھر پیوند اس کا ہے محال

معاصی سے اجتناب پر زور دیتے ہیں اور معاً اس پر حکمت سے استدلال بھی کرتے ہیں:

بازرہ اول گنہہ سے ایجواں تانہ ہوآخر کو تو خوار جہاں
اس بھروسے پر نکر ہر گز گناہ بخش دے گا جرم توبہ سے الٰہ
زہر بد ہے پاس ہو تریاق گو آگ سے بچ گرچہ پانی پاس ہو
گرچہ حکم انداز ہو ایجان تو ہو نہ ہرگز شیر کے تو دوبدو
پیرنا آتا ہو گر تجھ کو ہزار قعر جیحوں میں ولے غوطہ نہ مار

عشق حقیقی کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عشق خداوندی میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور ہر درد کا درماں ان کے نزدیک عشق حقیقی ہی ہے:

عشق کی ہردم نئی ہے ایکشاں عشق ہے صیقل گرِ مرآت جاں
عشق سے پیدا ہوئے کون ومکاں عشق سے روشن ہیں یہ دونوں جہاں
عشق ہے بیماری دل کا طبیب عشق ہے تریاق فاروق اے لبیب
عشق جس دل میں نہیں وہ دل نہیں گل سے بدتر ہے وہ دل اے مرددیں
بے خزاں ہے عشق کی باغ وبہار عشق کا ہردم نیا ہے کاروبار
تاابد سر سبز ہے گلزار عشق روز افزواں رونق بازار عشق

مرحبا اے عشق عالی مرتبت مرحبا اے عشق فرخندہ صفت
مرحبا اے شہسوار لا مکاں مرحبا اے رہنمائے گمرہاں
عشق کی یارب مجھے دے وہ شراب جس سے ہوں دل اور جگر جل کر کباب

آج سے تقریباً پونے دوسو سال قبل، کم وبیش ساڑھے تین ہزار اشعار اسی روانی و برجستگی کے ساتھ کہہ کر اپنی اس زندہ وتابندہ مثنوی گلزار ابراہیم کو درج ذیل اشعار پر ختم کرتے ہیں۔

جب ہوا اس مثنوی کا اختتام تھے سنین ہجرت خیرالانام
اے برادر بالیقیں بے ریب وشک یکہزار ودو صدوپنجاہ ویک
پانچویں تاریخ تھی شوال کی ختم جمعے کو ہوئی یہ مثنوی
حق تعالیٰ اس سے فیض عام دے میری محنت کا یہی انعام دے
نام حق پر ختم کر اپنی کتاب اے حسنؔ واللہ اعلم بالصواب

حق تعالیٰ نے واقعی اس محنت کا یہ انعام عطا فرمایا کہ یہ مثنوی ایسی قبول خاص وعام ہوئی کہ گھر گھر پڑھی جاتی اور ہر چھوٹے بڑے ناسمجھ ودانا کو درس معرفت اور ذوق حقیقت دیتی، ہر پڑھنے والا اپنی استعداد وصلاحیت کے موافق متاثر و مستفیض ہوتا۔

مولانا ابوالحسن کاندھلویؒ کی ایک دوسری مثنوی ''مثنوی سمجھ بوجھ'' دوسودو شعروں پر مشتمل اور گلزار ابراہیم ہی کی طرح مفید وموثر ہے، اس کی سطر سطر میں عشق الٰہی کی لہریں جوش مارتی ہیں، یہ مثنوی عرصہ تک سلوک کے ابتدائی نصاب میں داخل رہی، مشائخ اپنے مریدین کو اس مثنوی کو ورد میں رکھنے کی ہدایت وتاکید فرمایا کرتے تھے۔

مولانا ابوالحسن کاندھلوی کے شاعرانہ کمالات کا نمونہ اور ایک اہم کارنامہ مثنوی مولانا روم کے دفتر اول کے منظوم ترجمہ ''مجمع فیض العلوم'' کی تکمیل بھی ہے، یہ منظوم ترجمہ والد ماجد حضرت مفتی الٰہی بخشؒ نے شروع فرمایا تھا، صرف ایک ہزار اشعار کا ترجمہ ہوا تھا کہ کام درمیان میں رہ گیا۔

مفتی صاحب کے انتقال کے بعد مولانا ابوالحسن صاحب نے ترجمہ شروع کیا اور پہلے دفتر کی تکمیل کی اور حق یہ ہے کہ ترجمہ کا حق ادا کر دیا، کریم الدین پانی پتی طبقات الشعراء ہند میں لکھتے ہیں:

''ایسے ترجمے کم ہوتے ہیں'' محققین کی رائے ہے کہ اصل کی تاثیر اور تمام سوزش وسرمستی ترجمہ میں منتقل ہوگئی ہے۔

مولانا ابوالحسن کاندھلوی کو حضرت سید احمد شہیدؒ سے بے انتہاء عقیدت ومحبت اور ان کی تحریک جہاد سے بڑی دلچسپی اور گہری وابستگی تھی، مولانا نے حضرت سید صاحبؒ کے سفر حج سے واپسی پر ایک طویل قصیدہ پیش کیا تھا، اور ایک منظوم رسالہ جہادیہ بھی تحریر فرمایا تھا، یہ رسالہ جناب غلام رسول مہر صاحب نے جماعت المجاھدین میں نقل کیا ہے۔

مولانا کی بعض یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنے اردو وفارسی کلام کے دو دو دیوان بھی مرتب کئے تھے، مولانا کی نثری تالیفات میں دو کتابوں کا سراغ ملتا ہے ایک حل الغوامض اور رسالہ ''بحران حل الغوامض'' میراث کے موضوع پر عربی میں نہایت ضخیم اور جامع کتاب تھی۔

مولانا کے یہاں کم وبیش بیس سال تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا، تلامذہ کی فہرست میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا نام نامی لینا کافی رہے گا۔

مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی نے ۲۱ جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ مطابق ۲ مارچ ۱۸۵۳ء بروز چہارشنبہ کاندھلہ میں وفات پائی اور والد ماجد حضرت مفتی صاحبؒ کے پہلو میں اسودۂ خاک ہوئے۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو"

(۱) مجلّہ احوال و آثار حضرت مولانا انعام الحسن نمبر"

(۲) وضمیمہ امداد المشتاق از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

(۳) حالات مشائخ کاندھلہ، از مولانا احتشام الحسن کاندھلوی

رحمت اللہ نیپالی
مدرسہ فلاح المسلمین، رائے بریلی

# سید عبدالرزاق کلامی اور "صمصام الاسلام"

احساس ہی وہ شے ہے جو آدمی کے صحیح الدماغ ہونے کی بین دلیل اور اس کا واضح ثبوت ہے، اور زندگی کی کامیابی و ناکامی کا دار و مدار اسی احساس پر ہے، یہی احساس ہے جب کسی میں پیدا ہوتا ہے تو ترقی و کمال کی معراج کراتا ہے اور یہی احساس جب فنا اور شعور ختم ہو جاتا ہے تو انسانی ضمیر کو مردہ اور وجودِ انسانی کو ایک لاشئہ بے جان بنا دیتا ہے۔

اسی لئے ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہر حساس و باشعور شخصیت، سردی و گرمی، نفع و نقصان، عزت و دولت، عروج و زوال کا مرانی و نامرادی، اور خوشی و غمی کا احساس رکھتا ہے، اور اس کے لئے ہر ممکن جتن اور حتی المقدور کوشش و تدبیر کرتا ہے علامہ اقبال نے اسی احساس کی ستائش کرتے ہوئے کہا ہے ۔

احساس عمل کی چنگاری جس دل میں فروزاں ہوتی ہے
اس لب کا تبسم ہیرا ہے اس آنکھ کا آنسو موتی ہے

اور ایک موقع پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے ۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

وہ دل، دل نہیں بلکہ پتھر کی سل ہے جس میں ملت کے سود وزیاں کا احساس نہ ہو، وہ آدمی نہیں جس کے دل میں ملت کا درد نہ ہو اور وہ ؎

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کا مصداق نہ ہو۔

کسی شاعر وادیب اور مقرر وخطیب کی زبان میں طلاقت وسلاست، قلم میں جولانی، عبارت میں روانی، تحریر وتقریر میں اثر آفرینی ودلنوازی اور کسی طرح کی جاذبیت وکشش اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس کے نہاں خانۂ دل میں ملت کے لئے تڑپ، امت کے لئے کرب اور نوع انسانی کے لئے قلق واضطراب پیدا نہ ہو، کیونکہ انسان کا ایک امتیازی وصف دوسروں کے غم میں شریک ہونا بھی ہے۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جب تک دل صدموں سے دوچار نہ ہو اور قلب وجگر کے مضراب پر چوٹ نہ پڑے اس وقت تک نہ تو کوئی ساز چھڑتا ہے اور نہ ہی سوز وگداز پیدا ہوتا ہے۔ نہ نہنگوں کے نشیمن تہ وبالا کرنے والی موجیں اٹھتی ہیں اور نہ الفاظ وتعبیرات اپنا حقیقی جامہ زیب تن کرتے ہیں، قلب پریشان اور دل مضطر ہی سے تخیلات، افکار وخیالات کے طوفان اٹھتے اور فیضان جاری وساری ہوتا ہے۔

کسی شاعر کے اندر اگر فکر ارجمند، قلب ہوشمند اور دل دردمند نہ ہو تو وہ کوئی خاطر خواہ اور نتیجہ خیز خدمت انجام نہیں دے سکتا اور نہ اپنا کوئی اثر ڈال سکتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اسوۂ نبویؐ کی پیروی کرے اور اپنے نبی کی

تڑپ وکڑھن کو اپنے لئے نمونہ بنائے، اور آیت قرآنی "فلعلك باخع نفسك على آثارهم ان لم يؤمنوا بهذا الحديث أسفاً" کو اپنے سامنے رکھے۔

زمانہ قدیم ہی سے یہ دستور ہے کہ اسلامی شعراء برابر اپنے کلام کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کا دفاع اور دشمنان اسلام کی تردید کرتے آرہے ہیں، اور انھوں نے اپنے اشعار بطور تیر استعمال کئے ہیں۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ شعر جذبات کو بھڑکانے، دلوں کو اکسانے سینوں میں عزائم پیدا کرنے اور حوصلے کو دوبالا کرنے نیز سازِ دل چھیڑنے اور اس میں سوز وگداز پیدا کرنے میں اپنا اثر رکھتا ہے، اور مثبت ومنفی دونوں طرح کا اثر ڈالتا ہے، یہ ایک فطری اور تجرباتی امر ہے۔

امام غزالیؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "احیاء العلوم" میں فرماتے ہیں:

"سماع کا اثر دلوں پر محسوس طریقہ سے ہوتا ہے، جس کا دل سماع سے متاثر نہ ہو اور نہ ہی اس سے کوئی حرکت واضطراب پیدا ہو ایسا شخص ناقص وادھورا اور جادۂ اعتدال سے ہٹا ہوا ہے"

اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر وشاعری سے مطلقاً ممانعت نہیں فرمائی بلکہ اسے باقی وثابت رکھا اور اس سے کام لیا، چنانچہ ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے " ان من الشعر لحكمة" بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں اور ان میں حکمت ودانائی کی بات ہوتی ہے۔

یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت کعب بن زہیرؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا، اور وہ اتنا مقبول ٹھہرا اور پسند کیا گیا کہ بطور انعام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنی چادر عطا فرمادی، اسی لئے اس کا نام ہی قصیدہ بردہ

پڑ گیا۔

روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابتؓ سے فرمایا "فوالله لشعرك اشد عليهم من وقع السهام" قسم بخدا تمہارا شعر کفار پر تیروں سے زیادہ سخت پڑتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ نے عمرۃ القضاء کے موقع پر مکہ مکرمہ میں اللہ کے رسول کی خدمت میں اشعار پڑھے، حضرت عمرؓ نے کہا: اے ابن رواحہ: اللہ کے رسول کے سامنے اور حرم شریف میں شعر پڑھ رہے ہو؟

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خل عنه فهو أسرع فيهم من نضح السهام"

غرض کہ اسلامی شعراء عہد نبوی میں اسلام اور اہل اسلام کا دفاع کرتے تھے اور اس دفاع اور فریق مخالف سے نبرد آزمائی کو انھوں نے اپنا وظیفۂ حیات اور دستر زندگی بنالیا تھا۔

جب فتح الٰہی اور نصرت خداوندی آئی اور اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑی اور ٹھوس و مستحکم ستونوں پر اس کی خشت اول رکھی گئی تو شعر و شاعری کا رخ پھرا، اور دعوت وارشاد، رہبری و رہنمائی، تعلیم و تربیت اور اسلامی بیداری کے مقاصد کی طرف شعراء نے اپنی توجہات مرکوز کیں اور مابعد کے عصور وازمنہ میں مختلف زبانوں کے اندر یہ خدمت انجام دی گئی۔

قصہ مختصر جب ہم تاریخ مسلمانان ہند پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کا جائزہ لیتے ہیں تو دیگر اسلامی علوم وفنون کی طرح فن شعر و شاعری کے شاندار نمونے اور شاہکار ہمیں یہاں بھی ملتے ہیں۔

اس حقیقت سے سبھی بخوبی واقف ہیں کہ گزشتہ ادوار میں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی زبان فارسی تھی اور موجودہ دور میں اردو، یہ دونوں زبانیں عربی زبان کے بعد علوم اسلامیہ کا اپنے اندر کافی سرمایہ وذخیرہ رکھتی ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مدحیات اور نعت، عربی کی بنسبت ان کے حصے میں زیادہ آئے، اور ان کی تاثیر بھی اس پر مستزاد ہے۔

ہندوسانی اسلامی شعراء نے شعر کے تمام اصناف کا استعمال کیا اور ہر صنف سے کام لیا، مثلاً قصیدہ، رجز، تقیید، مثنویات، اور شاہنامے وغیرہ،

شاہنامہ، مثنویات کی ایک صنف ہے، قدیم عربی زبان میں اس کا وجود نہیں، البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ رجز سے مشابہ ہے، روبہ حجاج کے ایک طویل رجز پر مثنوی کا اطلاق ہوتا ہے۔

جب ہم عربی، فارسی اور اردو، تینوں زبانوں میں شاہنامے کی تاریخ کا جائزہ لیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کے اولین شعراء اور قائلین میں منصور بن احمد ''دقیقی'' اور حسن بن اسحاق طوسی معروف بہ ''فردوسی'' ہیں جیسا کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس کی صراحت اپنی مایہ ناز تصنیف ''شعرالعجم'' میں کی ہے۔

اردو زبان بھی شعر کے مثنویات اور شاہناموں کی صنف سے بھری پڑی ہے لیکن قابل تعجب بات یہ ہے کہ وہ حکمرانوں کے مفاخر اور بادشاہوں کے کارناموں اور مآثر سے تو پُر ہیں لیکن ایسی کسی مثنوی کا سراغ نہیں ملتا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اور آپ کے غزوات کا بیان ہو۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شعری قواعد کی پابندی والتزام کے ساتھ مثنویات میں تمام حادثات وواقعات کا بیان اور تذکرہ مشکل بات اور دشوار کام ہے، اور ذکرِ

رسول اور آپ کے جنگی واقعات اور غزوات کا بیان جوں کا توں ضروری ہے۔

لیکن عظیم شاعر محمد محسن کاکوروی نے ''صبح تجلی'' میں شیخ عبدالرزاق حسنی رائے بریلوی نے ''گوہر مخزون'' ''صمصام الاسلام'' اور ''قمقام الاسلام'' میں پوری تاریخی امانت کا لحاظ اور شعری قیود وقوافی کا خیال رکھتے ہوئے انتہائی محتاط انداز میں اس فریضہ کی انجام دہی فرمائی ہے۔

اس وقت ہمارا موضوع بحث شیخ عبدالرزاق اور ان کی مثنوی ''صمصام الاسلام'' ہے۔

اردو کی قدیم مثنویوں میں سحر البیان، گلزار نسیم اور زہر عشق کا تذکرہ بار بار آتا ہے، یا کسی قدر میر تقی میر کی ''دریائے عشق'' نواب محبت خاں کی ''اسرار محبت'' ہوش کی ''لیلیٰ مجنوں'' حقیقت کی ''ہشت گلزار'' مومن کی ''قول غمگین'' قلق کی ''طلسم الفت'' شوق کی ''بہار عشق'' میر کی ''معراج المضامین'' تسلیم کی ''شام غریباں'' شوق قدوائی کی ''ترانۂ شوق'' ہوش کی ''دفتر سحر'' کے نام بعض تذکرہ نویسوں نے کبھی کسی مناسبت سے ذکر کردیئے ہیں۔

لیکن مداح خیرالبشر محسن کاکوروی کی ''صبح تجلی'' اور اسلامی فتوحات کے ناظم، فردوسیٔ اسلام سید عبدالرزاق کلامی کی مثنوی ''صمصام الاسلام'' جو ۲۵؍ہزار رزمیہ اشعار پر مشتمل ہے، ان کے نام بھی ہمارے اردو کے تذکرہ نویسوں کو نہیں معلوم ہیں یا ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں کہ مذہب کی کمزوری کا داغ نہ لگ جائے، ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک طویل رزمیہ نظم جس میں سلاست اور روانی بھی ہے، اور حسن بیان بھی، بے ساختگی اور برجستگی بھی ہے، بیان میں تاثیر ہے، جوش اور ولولہ پیدا کرنے کی صلاحیت بھی ہے، وہ سرے سے ناقابل اعتناء ہو، اس مثنوی کی ابتدا اس طرح ہے۔

ادھر بھی ہو ساقی نگاہِ کرم
کرم ہے ترا عام، تری قسم
ملادے مرے لب سے جام شراب
ترستا ہوں لے لے کے نام شراب
پلادے تیز ایسی، چھکادے مجھے
بس اب مست و بے خود بنادے مجھے

شیخ عبدالرزاق بن محمد سعید بن حمید الدین حسنی رائے بریلوی، امیر کبیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد المدنی کی اولاد میں ہیں جن کی نسل میں نامور داعیان دین اور ممتاز مجاہدین اسلام پیدا ہوئے، حضرت شاہ علم اللہ حسنی اور حضرت سید احمد شہید سے کون ناواقف ہوگا یہ دونوں اسی خانوادہ کے چشم و چراغ اور اسی خاندان کے گوہر شب تاب ہیں، جن کی دعوت و اصلاح اور تجدید و احیاء کی کوشش اور جہاد و اعلاء کلمۃ اللہ کی تگ و تاز سے سرزمین ہند پر روٹھی ہوئی فصل بہار آگئی اور ایمان و ایقان اور دعوت و عزیمت کی بادِ بہاری چلی، جس سے قرن اول کی یاد تازہ ہوگئی اور عہد صحابہ کرامؓ کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔

آپ قرآن مجید کے حافظ، شعر و ادب کے ماہر، زبان کے فصیح، قواعد شعر و بیان کے واقف کار، دیندار اور پابند اوراد و اذکار تھے، خواجہ حمد نصیر آبادی سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا۔ ان کے قصائد میں سے ایک ''گوہر مخزون'' ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔

دراصل یہ علامہ ابن سید الناس کا انتخاب ہے جسے حضرت شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم دہلویؒ نے حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی فرمائش سے ''سرور المحزون'' کے

نام سے فارسی میں ترجمہ کیا، پھر اس کو شیخ عبدالرزاق کے عم محترم سید محمد بن علی بن عبدالسبحان حسنی نے فارسی میں منظوم کیا، اس کے بعد اس کا اردو ترجمہ سید ابوالقاسم حسینی واسطی نے کیا، جو "نور علی نور" کے نام سے طبع ہوا، بعد ازاں شیخ عبدالرزاق نے اسے "گوہر مخزون" کے نام سے اردو میں منظوم کیا، اور علامہ سید عبدالحی حسنیؒ نے اس پر مقدمہ لکھا ہے، یہ کتاب ۱۵۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ میں ۱۷ اشعار ہیں، مصنف نے اس کتاب کے اندر قواعد شعر کے التزام کے ساتھ ساتھ اس بات کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ الفاظ روایات واحادیث نہ چھوٹنے پائیں۔

ان کی ایک دوسری مثنوی غزوات نبوی پر مشتمل ہے، جس میں غزوۂ احد وخندق کے وقائع کا ذکر دینی جوش وخروش اور اسلامی غیرت وحمیت کے ساتھ کیا ہے یہ مثنوی ۱۳۳۲ھ میں شہر آگرہ کے مطبع "مفید عام" سے چھپی ہے۔

ان کی مثنوی "صمصام الاسلام" عمدہ بیان، حسن کلام اور شستگی وشگفتگی کا ایک مرقع اور دلوں پر اثر ڈالنے اور قلوب میں ایمان وجہاد کی چنگاری فروزاں کرنے میں نایاب کتاب ہے اور نوادرات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے یہ ایک عظیم مورخ امام محمد بن عمر بن واقد اسلمی (متوفی ۲۰۷ھ) کی مشہور ترین کتاب "فتوح الشام" کا منظوم ترجمہ ہے، جسے اردو کا شاہنامہ اسلام کہنا مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اعتراف ہے، یہ وہی واقدی ہیں جن کے بارے میں امام ذہبیؒ نے کہا ہے "ان کا ضعف تو متفق علیہ ہے لیکن پھر بھی مغازی کے سلسلہ میں ان سے بے نیازی نہیں اور ایام صحابہ کے تعلق سے اظہار استغناء نہیں کیا جا سکتا"۔

"فتوح الشام" دو جلدوں میں ہے، اس سے مراد عہد رسالت کے بعد عہد صدیقی میں عموماً اور عہد فاروقی میں خصوصاً حاصل ہونے والی ان فتوحات کا تذکرہ

جن میں شام، عراق، اور مصر اور ان کے علاوہ دیگر ممالک شامل ہیں۔

''صمصام الاسلام'' ۲۵ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، مؤلف نے حمد و مناجات اور درود وصلاۃ اور مدح وسلام سے کتاب کا آغاز کیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے زمانہ میں جناب عبدالرزاق صاحب حسنی متخلص بکلامی نے اس دشوار گزار راہ میں قدم رکھا اور واقدی کے غزوات کو بعینہ نظم میں ادا کیا، باوجود تعلیم کی پابندیوں کے واقعیت سے کہیں تجاوز نہیں پایا جاتا اور یہ سخت مشکل بات ہے.....
ایسے ثواب کا کام انہیں کے ہاتھ انجام پاسکتا تھا، خدا ان کو جزائے خیر دے (آمین)۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ مثنوی دو مرتبہ چھپی اور دونوں مرتبہ منشی نولکشور کے حصہ میں یہ سعادت آئی کہ وہ اس کو شائع کریں، آخری طبع پر ۱۲۹۲ھ ۱۸۸۲ء درج ہے، بڑی تقطیع پر اور ہر صفحہ پر عرض میں دو شعر ہیں، کل صفحات کی تعداد ۴۲۹ ہے، اس کے بعد دس صفحات میں تقریظیں منظوم درج ہیں، جو اس وقت کے علماء وادباء نے تحریر فرمائی تھیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ کے اضافی مقدمہ کے ساتھ پاکستان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

اس مثنوی سے ملحق ایک مختصر یعنی نو سو اشعار پر مشتمل مثنوی اور بھی ہے، جس کا عنوان ''قمقام الاسلام'' ہے، یہ مثنوی بہنسا اور مصر کی فتوحات کا ذریعہ داستان ہے، اس کا نصف اول مولانا سید ابوالقاسم مشہدی کے قلم سے ہے، نصف آخر صاحب صمصام، مولانا عبدالرزاق

کلامی کے قلم سے ہے، لیکن نہ تو اس کی تعیین کی گئی ہے کہ کہاں تک حضرت مشہدی کا کلام ہے اور کہاں سے مولانا عبدالرزاق کلامی کی نظم شروع ہوتی ہے، اور نہ نظم کی روانی اور اسلوب سے پتہ چلتا ہے، اس طرح قلم سے قلم ملا دینا بھی ایک کرامت ہی ہے۔

ہم اس مقالہ کا اختتام ''کاروان زندگی'' حصہ اول کے ایک اقتباس پر کرتے ہیں، جس میں صاحب کتاب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس مثنوی اور اس کے مصنف کا تذکرہ وتعارف کراتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

''ہمارے خاندان میں ایک بڑا اچھا دستور تھا کہ جہاں کوئی ایسا غمناک واقعہ پیش آتا، دل دکھے ہوئے ہوتے یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو ''صمصام الاسلام'' سنی جاتی، یہ مشہور مؤرخ واقدی کی مشہور کتاب ''فتوح الشام'' کا پچیس ہزار اشعار میں ترجمہ ہے، یہ ترجمہ اور نظم ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ، میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھا منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی لکھی ہوئی ہے، جوش وخروش سے بھری ہوئی، درد واثر میں ڈوبی ہوئی، جنگ کا نقشہ ایسا کھینچتے کہ دل جوش سے اچھلنے لگتے ہیں اور نبض تیز ہوجاتی ہے، شہادت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ خود راہِ خدا میں جان دینے کے لئے دل بے تاب ہوجاتا ہے، اور صحابۂ کرام اور مجاہدین کے غم کے سامنے آدمی اپنا غم بھول جاتا ہے''

(کاروان زندگی ج ۱ ص ۸۲-۸۳، باب سوم)

## مراجع ومصادر

(۱) تعمیر حیات-۱۰ر جنوری ۲۰۰۳ء (۲) الرائد-۱۱ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(۳) کاروان زندگی اول (۴) نگارشات (۵) صمصام الاسلام (۶) حیات فخر الدین خیالی

محمد فرمان نیپالی

# تذکرہ نگاری میں مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کا حصہ

# ''گل رعنا'' کے آئینہ میں

تذکرہ نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں تذکرہ نگار کی شخصیت اس کی خدمات، اس کی کاوشیں اور زبان وادب کو فروغ دینے میں اس کی جہد مسلسل کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے، تذکرے جہاں ایک طرف یہ بتاتے ہیں کہ زبان وادب کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ وہیں دوسری طرف اس کی نشان دہی بھی کرتے ہیں کہ کب اور کس زمانہ میں کتنی خدمت انجام دی گئی، اور اسے کتنا سراہا گیا اس جد وجہد میں کون کون حضرات شامل ہیں، ان کی کیا کیا خدمات رہی ہیں؟ یہی وہ تمام امور ہیں جو تذکرہ میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں اور ان پر بالتفصیل روشنی ڈالی جاتی ہے۔

تذکرہ عربی لغت میں یاد کرنے کے معنی میں ہے، خاص طور پر علامہ ابن منظور نے ''لسان العرب'' میں یہی معنی ذکر کئے ہیں، فارسی کی ایک وقیع لغت ''فرہنگ عمید'' کے مطابق تذکرہ اصطلاحاً اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں شعراء کے حالات جمع کئے جائیں، رفتہ رفتہ تذکرہ اس تاریخ کے معنی میں بھی استعمال

ہونے لگا جس میں شعراء کے حالات ونمونہ کلام پر تعریف وتبصرہ ہو، تذکرہ نگاری کے سلسلہ میں عربی اور فارسی کا دامن چونکہ بہت وسیع ہے اسی وجہ سے ہمیں عربی مجموعۂ کلام میں تذکرہ نگاری کے نمونے بکثرت ملتے ہیں، عربی زبان وادب کے باحثین کا کہنا ہے کہ عربی تذکرہ نگاری کا آغاز عہد عباسی میں ہوا، اولین عربی تذکرہ نگاروں نے ابن اسلام متوفی ۸۴۵ھ صاحب طبقات الشعراء، اور ابو محمد عبداللہ بن مسلم قتیبہ صاحب الشعر والشعراء ہیں اس کے بعد اس صنف کو خاصا فروغ حاصل ہوا اور تذکرہ نگاروں کی ایک جماعت، تذکرہ نگاری کرتی رہی، فارسی زبان میں ادب کی اس صنف کا آغاز ۱۲۲۱ھ کے قریب ہوا، محققین نے لکھا ہے کہ بدرالدین محمد بن عوفی متوطن بخارا کی کتاب ''لباب الالباب'' شعرائے فارسی کا اولین تذکرہ تسلیم کی گئی، عوفی نے چونکہ بحیثیت ایک سیاح کے اپنی زندگی کے اکثر حصے بسر کئے، لیکن اخیر عمر میں آکر گورنر سندھ ناصرالدین قباچہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے اور ان کی یہ کتاب ''لباب الالباب'' ہندوستان کی سرزمین پر لکھی گئی، اس طور پر ہندوستان کے لئے نہایت فخر وانبساط کا مقام ہے کہ فارسی میں تذکرہ کی پہلی کتاب پہلی بار مرتب ہوئی، اس کے بعد دیگر کتابیں مثلاً ''روضۃ السلاطین'' ''جواہر العجائب'' ''خلاصۃ الشعراء'' وغیرہ کتابیں منظر عام پر آئیں۔

سولہویں صدی کے آغاز تک عربی اور فارسی شعراء کے تذکرے ان دونوں زبان میں لکھے جا چکے تھے، لیکن جب سولہویں صدی عیسوی کا آدھا حصہ گذر چکا تو اردو شعراء کے تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے اور ان میں استاد میر تقی میر نے نکات الشعراء لکھ کر اولیت حاصل کی، اور بقول مولانا عبدالحئ حسنی ''اسے اردو شعراء کا پہلا تذکرہ تسلیم کیا گیا''، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ گل رعنا کے

مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''ہندوستان میں ترکی وافغانی النسل فاتحین اور حکمرانوں کے اثر سے فارسی ہی تصنیفی ودفتری زبان قرار پائی، اور ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد ہر قسم کے سنجیدہ وعلمی کام یہاں تک کہ مراسلت، باپ بیٹوں اور دوستوں کی خط وکتابت بھی بالعموم اسی زبان میں ہوتی تھی، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اردو شعراء کے تذکرے ۱۸۵۷ء تک فارسی ہی میں لکھے گئے یہ سب تذکرے اردو شاعری کے خدو خال اس کی زبان کے نکتوں، اشعار کی نوک و پلک اور شعراء کی امتیازی خصوصیت اور ان کے کلام کو ظاہر کرنے کے لئے لکھے گئے، اور ان میں تمام تر ان کے اردو کلام کا نمونہ ہی پیش کیا گیا، لیکن تذکروں کی زبان فارسی ہی ہے، چنانچہ میر تقی میر کی نکات الشعراء، میر حسن اور مصحفی کے تذکرے، مولوی قدرت اللہ کی طبقات الشعراء، فتح علی شاہ کا تذکرہ اسی طرح سے بزم سخن، مہر جہاں تاب اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ''گلشن بے خار'' سب فارسی ہی میں ہیں۔

اردو زبان میں اردو شعراء کی سب سے پہلے جس شخص نے تذکرہ نگاری کی اور اس میں اہم مقام پیدا کیا وہ مولوی محمد حسین آزاد کے نام سے مشہور ومعروف ہیں، ان کی بے مثال کتاب ''آب حیات'' بعد کی لکھی ہوئی کتابوں کی مرجع رہی ہے، مولانا محمد حسین آزاد جو استاذ ذوق کے عزیز شاگرد تھے، انہوں نے ذوق، غالب، مومن، شیفتہ کی مجلسیں اور بے تکلف صحبتیں دیکھیں تھیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''مولوی حسین آزاد کا سب سے بڑا علمی وادبی کارنامہ اور اردو پر احسان ہے کہ آب حیات لکھ کر انہوں نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی، وہ اردو زبان وادب وشاعری کے گہوارہ میں پلے تھے، ان کا خمیر شعر وادب سے اٹھا تھا، اور اس کا ذوق ان کے رگ

وریشہ میں پیوست ہو گیا تھا، وہ پیدائشی طور پر سخن فہم وسخن شناس تھے، ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں ان کے اس وقیع کارنامہ کو اہمیت دی ہے کہ ''سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی آب حیات ہے جو اردو زبان کی اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے، ایک دوسری جگہ اس کتاب کی مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نا درست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم نے لکھ دی ہیں وہ آج اردو کی انشا پردازی کے قالب میں روح کی طرح پیوست ہو گئی ہیں'' لیکن ان تمام خصوصیات وامتیازات کے باوجود یہ کتاب نقائص اور خامیوں سے خالی نہیں ہے۔

یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ ادب تخیل پسند ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز کے لئے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے اور تاریخ اپنے سفر کے لئے ایک محدود اور نپا تلا راستہ، ادب تشبیہ واستعارہ اور تخیل سے آب ورنگ پیدا کرتا ہے، اور تاریخ حوالوں، واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گراں بار ہوتی ہے، مولانا آزاد چونکہ فطرتاً ادیب تھے، اور ادب وحسن انشا ان کے اصل تیغ قلم کا جوہر ہے ان کا اصل مزاج اور رجحان طبیعت ادب وانشا پردازی ہے، خواہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں یہ ذوق ان پر غالب آکر رہتا ہے اور بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کہ اس کی مثال اگر کسی کو دیکھنا ہو تو ''دربار اکبری'' کا مطالعہ کرے۔

آب حیات میں جن شعراء کا تذکرہ ہے بہت خوب ہے، اور آزاد نے ان پر دل کھول کر لکھا ہے، بعض دیگر شعراء آب حیات میں مذکورہ شعراء سے بلند پایہ

تھے،لیکن آزاد نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے،مثلاً طبقۂ متقدمین میں مولانا نصرتی، فقیراللہ آرزو وغیرہ ،طبقہ متوسطین میں بہادر شاہ ظفر،نواب مصطفیٰ شیفتہ ،اور کرامت علی شہیدی کا تذکرہ نہیں ہے،نواب مصطفیٰ شیفتہ جن کا اپنے زمانہ میں طوطی بولتا تھا ان کو صرف نام اور ولدیت اور گلشن بے خار کے مصنف کی حیثیت سے ذکر کیا ہے،(ملاحظہ ہو آب حیات ص ۴۰۸) اسی طرح لکھنؤ کے مشہور شاعر امیر مینائی،نواب مرزا خاں داغ،میر مہدی مجروح کا بھی تذکرہ نہیں ہے،آب حیات میں متعدد تاریخی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں،اور بعض ایسے بیانات ملتے ہیں جن کی تصدیق مراجع کی کتابوں سے نہیں ہوتی ہے،اور یہ حقیقت ہے کہ میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعراء آزاد کی نظر سے نہیں گذرا،مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے نکات الشعراء کے مقدمہ میں اس کو پرزور انداز میں واضح کیا ہے،ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''میری بدگمانی معاف ہو تو کہوں گا کہ نکات الشعراء آزاد کی نظر سے نہیں گذری، آزاد نے قیاس کی بلند پروازوں کو طوطا مینا بنا کر اڑائے ہیں،اور اس کی سحر بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہے۔''

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ''حیات عبدالحئ'' میں آب حیات اور نکات الشعراء کے متعدد مقامات میں تضاد ظاہر کیا ہے،تفصیل کے لئے حیات عبدالحئ کا آخری باب پڑھا جا سکتا ہے۔مولانا حسین آزاد نے میر صاحب پر یہ الزام لگایا کہ وہ بد دماغ اور نازک مزاج تھے اور مرزا مظہر جان جاناں جو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے معاصر ہیں،اور جو ہندوستان کی باکمال ہستیوں میں ہیں جن کے وجود سے اس سرزمین کو فخر ہے،ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک تنگ مزاج مغلوب الغضب اور غیر مہذب انسان تھے،مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ آزاد

کی ان ناہمواریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ’’یہ ان چند تاریخی فروگذاشتوں اور غیر محتاط یا مبالغہ آمیز تصویر کشی کی چند مثالیں ہیں جو آب حیات کے صاف آئینہ پر دھبہ کی طرح نمایاں ہوتی ہے، ان کی تحقیق اور اصل واقعہ کا اظہار کرنا دیانت دار مؤرخ کا فرض تھا جو اس موضوع پر آزاد کے بعد قلم اٹھاتا اور بحمداللہ ہمارے علم میں سب سے پہلے گل رعنا میں مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی ندویؒ نے اس فرض کو انجام دینے کی بھرپور کوشش کی ہے‘‘۔

مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی ندویؒ جس خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے وہ علم وادب، شعروسخن میں امتیاز رکھنے والا خاندان تھا، ان کے والد محترم مولانا سید فخرالدین خیالی، مشہور شاعروں اور ادیبوں میں تھے، اور ادبی دنیا میں اپنا ایک وزن رکھتے تھے، ان کی کئی کتابیں اردو ادب سے متعلق منظر عام پر آچکی ہیں جن سے کثیر تعداد لوگ فائدہ اٹھارہے ہیں اور اپنی علمی تشنگی بجھارہے ہیں، عربی کا ایک محاورہ ہے، الو لدسر لابیہ اور کل فتاة معجب بأ بیہا چنانچہ مولانا کے اندر ادبی حس کا پیدا ہونا اور باذوق انسان ہونا ایک فطری بات ہے، اور عربی شاعر کے بقول:

أتـانـی هـو اهاقبل أن أعراف الهوی
فـصـادف قـلـبـاً خـالـیاً فتمكـنـا

مولانا عبدالحئی حسنی نہ صرف ایک عالمِ دین اور ادیب موہوب تھے بلکہ وہ ایک تاریخ نویس اور تذکرہ نگار بھی تھے، عربی زبان میں ان کو خاصی درک وبصیرت حاصل تھی، طالب علم ہی کے دور سے اپنے استاذ مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے ایک مضمون کو دیکھ کر ہندوستان کے مشاہیر اور بادشاہوں کی تاریخ مرتب کرنا شروع کردیا تھا، مشکل سے تین سال کا ایک مختصر سا عرصہ گزرا کہ ان کے جمع کردہ مواد

آٹھ جلدوں میں ''نزہتہ الخواطر، بہجتہ المسامع والنواظر'' کے نام سے کتابی شکل میں منظرعام پر آگئے، اوراب یہ کتاب دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی سے الأعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام مفکراسلام حضرت مولانا سیدابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے دقیع مقدمہ کے ساتھ زیورطبع سے آراستہ ہوکر منصۂ شہود پر آچکی ہے۔

مولانا سید عبدالحئی حسنی کے اسی ادبی ذوق نے آب حیات کی فروگذاشتوں کو برداشت نہیں کیا، اورانہوں نے گل رعنا جیسی جامع ومانع مفصل کتاب لکھی اور ''العلم صید والکتابة قید'' کا پوراپوراحق ادا کیا، اورکسی کم ظرف کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ،

تاریخ کے ورقوں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

گل رعنا میں مصنف نے نہ صرف یہ کہ آب حیات کے مصنف کی فروگذاشتوں کی نشان دہی کی ہے بلکہ ایک نئے طرز، نئے اسلوب، اور نئے رنگ وآہنگ کی لڑی میں شعرائے اردوادب کواس طرح پرودیا ہے کہ اگران میں سے ایک کا بھی ذکر چھوٹ جائے تو تاریخ اورتذکرہ ناتمام رہے گا، اس طرح انہوں نے شعروادب کے ایک تاریخی حصہ کو پایہ تکمیل تک پہنچادیا، مصنف مرحوم نے اس کتاب کوتین حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ طبقۂ متقدمین کے لئے مخصوص ہے، دوسرا متوسطین سے اورتیسرا متاخرین کے ساتھ خاص ہے۔

تاریخ اردوادب کا ہر متعلم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ اردو شاعری کی ابتداء اورظہور سرزمین حیدرآباد دکن سے ہوا، اس لئے مصنفؒ نے شعرائے دکن اورشعرائے دلی کا تذکرہ درجہ بدرجہ کیا ہے، نہ صرف یہ کہ انہیں شعراء

کا تذکرہ کیا بلکہ اور دیگر شعراء، ان کے سوانحی خاکے اور ان کی اس طرح تذکرہ نگاری کی ہے جو اپنی جگہ پر بے مثال ہے، اور شعر کا خاصا نمونہ بھی پیش کر دیا ہے تا کہ شاعر کے اسلوب کلام کو براہ راست سمجھا جا سکے، اور اس کے اشعار کے اندر جو جدتیں اور ندرتیں ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

مصنف نے اس کتاب کا مسودہ مولانا سید سلیمان ندوی سابق ناظم دارالمصنفین، کے حوالہ کیا، اور ابھی یہ کتاب چھپ کر آئی بھی نہ تھی کہ اس عرصہ میں ان کا انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور وہ کتاب کی مطبوعہ شکل کو نہ دیکھ سکے، جب یہ کتاب پہلی مرتبہ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ میں چھپ کر آئی تو لوگوں نے اس غیر متوقع نعمت کو حاصل کرتے ہی مصنف علیہ الرحمہ کو خراج عقیدت پیش کیا، اور مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کے رسالہ اردو میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا کہ ''جو لوگ مولانا مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، انہیں ممکن ہے کہ اس کا علم ہو ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا اردو زبان و ادب کا ذوق رکھتے ہیں..... معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق انہیں اپنے والد سے ورثہ ملا تھا، جو فارسی کے اچھے شاعر تھے، اور جن کا حال اور کلام کا نمونہ حکیم صاحب نے کتاب کے اخیر میں دیا ہے'' ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ''اس کتاب میں ہر شاعر کے کلام سے نمونے بھی دئے گئے ہیں، جس سے فاضل مؤلف کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے، اور شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۵ء، ہندوستان میں چونکہ تاریخ و تراجم لوگوں کا ایک خاص موضوع رہا ہے اس لئے کتاب میں مفید اور نافع حاشیے بھی دئے گئے ہیں جو انشا پردازی اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری اور تذکرے کا اعلیٰ نمونہ بھی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب تذکرہ شعرائے اردو مسمیٰ بہ گل رعنا تذکرہ نگاری میں اہم مقام رکھتی ہے ،اور متقدمین کی تذکرہ نگاری کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے اندر پائی جانے والی خامیوں اور ناہمواریوں پر انگلی رکھتی ہے اوران کی نشاندہی کرتی ہے اور اپنی حقیقت پسندی وسادگی کو برقرار رکھتے ہوئے ہر ایک کو مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔

ازمحمد ثناء الہدیٰ قاسمی

# اسلامی ادب کے علم بردار

## مولانا سید احمد عروج قادری

برصغیر ہندو پاک میں جن اولوالعزم ادیبوں اور شاعروں نے ادب اسلامی کے علم کو بلند کیا اور اسے خدا بیزار اور مادیت پرست ادبی تحریکوں کے مقابلہ لا کھڑا کیا، اور اس کام کے لئے اپنی ساری صلاحیت، توانائی اور قلمی کاوشیں صرف کردیں، ان میں ایک اہم اور معتبر نام مولانا سید احمد عروج قادری کا ہے، ۱۹۵۷ء کے آس پاس جب اردو ادب میں ایک نئی تحریک ''ادارہ ادب اسلامی'' کے نام سے شروع کی گئی تو مولانا عروج قادری اس کے تاسیسی ممبران میں تھے، ان کی فعالیت اور تحریک کے لئے سرگرمی کو دیکھ کر بعد میں انہیں اس تحریک کا صدر بنادیا گیا، وہ اس ادارہ کے ترجمان ''دانش'' کے مدیر بھی رہے، ان کے مخصوص رنگ وآہنگ میں لکھے اداریوں نے اس تحریک کے خد و خال کو واضح کیا، اسلامی اور غیر اسلامی ادب میں ان کی تحریروں نے حد فاصل قائم کیا اور اس کے حدود متعین کئے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

''اسلامی ادب ایک ایسا سدا بہار گلشن ہے جو توحید کی

زمین پر اگتا، وحی الٰہی کی پاکیزہ بارش سے سیراب ہوتا اور آخرت کی لازوال خوشبو سے مہکتا ہے اور غیر اسلامی ادب ایک ایسا صحرائے خاردار ہے جو الحاد و شرک کی زمین پر پنپتا ہے مادیت کے گدلے پانی سے پھیلتا اور نفسانیت، عریانیت، فحاشی اور ہوا و ہوس کی بدبو سے وبال جان بنتا ہے"۔

اسلامی ادب کے اس عظیم علم بردار کی ولادت امجھر شریف، تھانہ ہیلورہ ضلع اورنگ آباد بہار کے علمی خانوادہ سید عبداللہ قادری بن سید تبارک حسین بن سید کرامت علی قادری حسنی کے گھر ۲۴ر مارچ ۱۹۱۳ء مطابق ۱۵ر ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ بروز پیر بوقت دس بجے شب ہوئی، ابتدائی تعلیم امجھر شریف میں حاصل کرنے کے بعد مدرسہ محمدیہ میں داخلہ لیا، اور سند فراغ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے حاصل کیا، خانقاہ کبیریہ سہسرام مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں چند سالوں کی تدریس کے اپنی مادر علمی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے اور ۱۹۵۳ء تک تفسیر قرآن، کتب احادیث اور فقہ کی متداول کتابوں کا درس دیتے رہے، ۱۹۴۶ء میں ہی تحریک اسلامی سے وابستہ ہوئے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے انہیں جماعت اسلامی کا رکن بنالیا، حکومت کے ایوان میں اس جماعت کا شناخت ان دنوں حکومت مخالف کی حیثیت سے تھی، اس لئے سرکاری ادارے اور محکمے اس جماعت کے ارکان کو راس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا عروج قادری پر دار و گیر شروع ہوئی اور داخلی و خارجی طور پر ایسا ماحول تیار ہوا کہ آپ نے مدرسہ شمس الہدیٰ سے استعفیٰ دیدیا، رام پور اندنوں تحریک کا بڑا مرکز تھا، اور جماعت کو ایک اچھے فعال، ذی علم کارکن کی ضرورت تھی چنانچہ جماعت اسلامی کے ذمہ داروں کی دعوت پر آپ پٹنہ سے رام پور منتقل ہوئے، اور تیس

سال تک رام پور کو ہی اپنا مستقر بنائے رکھا اس درمیان ۱۹۵۶ء سے انہوں نے جماعت اسلامی ہند کی ثانوی درس گاہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے شروع کئے بعد میں وہ رسالہ ''زندگی'' کے مدیر بنادیئے گئے جہاں ان کو اپنی فکر کی ترسیل کا بڑا میدان ملا، اور انہوں نے اس رسالے سے بڑا کام لیا، اور دم واپسیں تک اس کے ذریعہ اسلامی اقدار وافکار کی ترویج واشاعت کرتے رہے، اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کیا اور تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی اپنی ایک شناخت بنائی۔

پروفیسر عبدالمغنی کے ایک مقالہ پر بحیثیت ایڈیٹر ۱۹۶۹ء میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیئے گئے، چھ گھنٹے کے بعد وہاں سے عزم جواں لے کر نکلے اور پرورش لوح وقلم میں لگ گئے، ۵رجولائی ۱۹۷۵ء کو قائم مقام امیر جماعت اسلامی ہند کی حیثیت سے دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی اور تہاڑ جیل میں ڈال دیئے گئے، اس اسیری کی یادگار نظم کے چند اشعار یہ ہیں۔

تہاڑ جیل میں یہ بات بھی معلوم ہوئی
کتاب ظلم میں ہے جرم بے گناہی بھی
جو جانتے بھی نہیں ہیں کسی جماعت کو
پکڑ کے لئے گئے ہیں کچھ ایسے راہی بھی

اس حال میں بھی ان کے عزم وحوصلہ کا حال یہ تھا کہ:

کسی دیوار نے سیل جنوں روکا نہیں اب تک
کوئی مجنوں یہ مصرع لکھ گیا دیوار زنداں پر

تہاڑ جیل میں قید وبند کی صعوبت سے انہیں کیوں گزرنا پڑا اور علم وقلم کے اس مسافر کا کیا جرم تھا، جس کی وجہ سے انہیں دھر دبوچا گیا، اس موضوع پر انہوں

نے اپنی نظم ''فردِ جرم'' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہم نے چاہا کہ ترا بول ہو سب سے بالا
اور ہو جائے ترے دین کا پرچم اونچا
ہم نے چاہا کہ زمیں پر ترا قرآن چلے
ترا قانون چلے اور ترا فرمان چلے
مالک الملک ہے تو ہم ہیں رعیت تیری
ہم نے چاہا کہ نافذ ہو شریعت تیری
دین بنیاد ہے پاکیزہ سیاست کے لئے
دین بنیاد ہے بے داغ حکومت کے لئے
دیں سیاست سے جدا ہو تو نری چنگیزی
جبر سے ظلم سے بھر پور نری پرویزی
بس یہی بات ہے دراصل جو ہم کہتے ہیں
اور اس کے لئے الزام سبھی سہتے ہیں
ہم اسی جرم میں دراصل گرفتار ہوئے
قید خانے کی جفاؤں کے سزاوار ہوئے
مہر دفتر پہ جماعت پہ لگی پابندی
حق کی تبلیغ و اشاعت پہ لگی پابندی
باعث غیظ وغضب اس کے سوا کچھ بھی نہیں
بین لگنے کا سبب اس کے سوا کچھ بھی نہیں

مشکل سے مشکل حالات سے آدمی نبرد آزما ہوتا ہے اور ہر تاریک رات کی

سحر ہوتی ہے، مولانا عروج قادری کی ان مشکلات اور قید و بند کا خاتمہ ساڑھے چھ ماہ کے بعد ۲۰ر جنوری ۱۹۷۶ء کو ہوا جیل میں جو دفعات لگائی گئی تھیں اس میں اس کی گنجائش تھی کہ معافی مانگ کر رہائی پائی جائے، لیکن اس مردِ حق آگاہ نے اس کو گوارہ نہ کیا اور لمبی مدت تک جیل میں رہنا گوارہ کرلیا۔

زندگی کے مختلف ماہ و سال میں مولانا عروج قادری مسلم پرسنل لا بورڈ اور مسلم مجلس مشاورت کے ممبر بھی رہے، درس قرآن ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور رام پور کی ایک مسجد میں وہ پابندی سے درس دیا کرتے تھے، پوری زندگی اقامت دین اور اسلامی افکار کی ترویج و اشاعت کے لئے ہر محاذ پر لڑنے والا یہ مجاہد ۱۹۸۶ء بروز سنیچر ۴ر بجے صبح جان جاں آفریں کے سپرد کردیا۔ ع

سدا رہے نام اللہ کا

مولانا کی تصنیفات میں ماہنامہ زندگی اور ماہنامہ دانش، میں چھپے اداریوں اور مقالات کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، حلیۃ النبیؐ، فسادات کا علاج، امت مسلمہ کا نصب العین، شیخ عبدالقادر جیلانی کی زندگی کا اصل کارنامہ، حضرت یوسفؑ قرآن کے آئینہ میں، آداب ازدواج، اقامت دین فرض ہے، اولیاء اللہ، عشر و زکوۃ اور سود کے چند مسائل، مقصد زندگی تصوف کی تین اہم کتابیں عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح پر ایک نظر، اسلامی تصوف، نفقہ مطلقہ کا فیصلہ اور پارلیامنٹ میں بے جا وکالت، عبادت، اصلاح و تربیت خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔

مولانا کی ان ساری کتابوں میں ان کا مقصد زندگی اقامت دین نمایاں ہے، یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور یہی ان کے کام کا اصل میدان، مولانا کے ان کتابوں کی نثر ادبی حیثیت سے مکمل سہل رواں اور شستہ ہے، ان میں ادب کی زیریں

لہریں موج زن ہیں، جو قاری کے شوق مطالعہ کو مہمیز کرتی رہتی ہیں، مشہور ناقد ڈاکٹر عبدالمغنی نے مولانا کی نثر کے بارے میں لکھا ہے:

''مولانا کی نثر نہایت شستہ رواں اور سلیس ہے، ان کے اسلوب میں قدرے مزاج کی چاشنی بھی ہے جس میں ظرافت کا رنگ غالب ہے، گرچہ کبھی کبھی طنز کا نشتر بھی نمایاں ہوتا ہے، خاص کر جب وہ فاسد خیالات یا ناقص افکار پر تنقید کرتے ہیں، اس سے طرز بیان میں تلخی تو نہیں مگر تیکھا پن پیدا ہوجاتا ہے۔ (رفیق کاعروج نمبر ص ۵۱)

فیض الحق صاحب لکھتے ہیں:

''آپ ایک مفکر، مبلغ اور داعی ہونے کے ساتھ ساتھ ادب اسلامی کے ایک بلند پایہ فنکار بھی، اردو ادب میں آپ کی شخصیت ایک قدر آور شخصیت تھی اور آپ کا ادب ایک عہد آفریں ادب تھا، آپ نے دنیا کے سامنے وہ ادبی تخلیقات پیش کیں جس کے ہاتھوں میں زندگی کی نبض تھی، آپ کا اسلوب نگارش متین وسادہ زبان وادب کی چاشنی لئے ہوتا تھا، اور اس میں دینی فکر کی ہم آہنگی پیدا کردیتی تھی۔''

نثر کے ساتھ عروج قادری نے اشعار کو بھی تحریک کی ترویج واشاعت اور مقبول عام بنانے کے لئے استعمال کیا اور ایسی شاعری کی جس میں بقول سید فضل اللہ قادری ''صحت مند مقصدیت زندگی کی اعلیٰ قدروں کی تابناکی، جوش بیان، حکمت و صداقت اور دعوت فکر وعمل پائی جاتی ہے۔

عروج قادری کی شاعری کے تین ادوار ہیں، جن کو سمجھنے کے لئے ان کے تین مجموعہ کلام، سمت سفر، تحفہ زنداں، اور فیض کعبہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، مولانا نے جب شاعری کی ابتدا کی تو سائنس کالج پٹنہ کے ایک شعری مقابلہ میں اپنی نظم ''تصور ماضی'' کے عنوان سے سنائی جو بطرز مسدس عہد خلافت راشدہ کے چند واقعات پر مشتمل تھی، مجمع ساکت وصامت رہا، نہ داد کا غلغلہ بلند ہوا، اور نہ بیدار (ہوٹنگ) ہی ہوئی البتہ جب اسٹیج سے نیچے اترے تو کرسیوں کی پہلی صف میں بیٹھے ایک صاحب نے مضحکہ خیز انداز میں فرمایا ''واہ مولانا آپ نے بخاری خوب نظم کی۔''

مولانا نے اس تبصرہ کو سن کر کچھ دن تک اپنی شاعری کا رخ بدلا، جسے وہ اپنے الفاظ میں ''بوالہوسی'' کہا کرتے تھے، اس تھوڑے ماہ وسال کو چھوڑ کر جس میں ان کی شاعری کا مقصد داد طلبی اور تفریح تھی، بعد کے سارے ادوار میں آپ کی شاعری اسلامی شاعری کا بہترین نمونہ اور ان کے مقصد حیات کی بہترین ترجمان ہے، خود ہی کہتے ہیں:

شعر وسخن بھی تیرے لئے ہے
میرا یہ فن بھی تیرے لئے ہے
الحمدللہ، والشکر للہ

اور پھر یہ کہ

مٹی ہے مقصود کہ پیمانہ رنگین و سبک
فن کو مقصود بنانا مجھے منظور نہیں
محض فن کار کہے جانے کی خاطر اے دوست
کاغذی پھول سجانا مجھے منظور نہیں

انہیں نقادانِ فن سے اس بات کا گلہ تھا کہ وہ ادب وشاعری کو مقصدِ حیات، پیغام کی بلندی، اور آفاقی قدروں کے اعتبار سے ناپنے کے بجائے خود ساختہ پیمانوں کا استعمال کرتے ہیں اور فن کے معیار کی تعیین میں فکر کی عظمت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ایسے تمام مضامین جنہیں اسلامی اقدار کی بات کہی گئی ہو، اسے وعظ وتبلیغ کی پھبتی کس کر القط کر دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

مثنوی ہو کہ غزل، نظم، رباعی، قطعہ
ایک کسوٹی پہ نقاد کسا کرتے ہیں
وعظ وتبلیغ تو ان میں کہیں موجود نہیں
یہ اسی بحث وتفحص میں رہا کرتے ہیں

مولانا کی رائے یہ تھی کہ ادب میں فن سے زیادہ فکر کی اہمیت ہے، بات کیسے کہی جارہی ہے، اتنی اہم چیز نہیں ہے، جتنی یہ کہ کیا کہی جارہی ہے، اس معاملہ میں ان کا کہنا تھا کہ:

"اگر کسی نثر میں اسلام کی کھلی ہوئی دعوت راست انداز بیان اور واضح نصیحت وموعظت اس کی ناکامی وبے اثری کی دلیل نہیں ہے تو آخر نظم میں اس کو ناکامی وبے اثری کی دلیل کیوں بنالیا جاتا ہے"

فرماتے ہیں:

نثر میں وعظ جو خود کہتے ہیں لمبی لمبی
شعر میں وعظ کو کہتے ہیں وہ محبوب وقبیح
نثر اور نظم میں یہ فرق کہاں سے آیا

کاش سمجھائے کوئی مجھ کو بالفاظ صریح

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فکر وخیال کو فن کا خوبصورت لباس نہیں پہناتے تھے، ان کی شاعری میں وزن، بحر، قافیہ اور ردیف کی پابندی کا سخت التزام ملتا ہے، تشبیہ واستعارہ کے استعمال سے بھی انہیں الرجی نہیں ہے، البتہ وہ ایسی ایمائیت و رمزیت جو معنی کی ترسیل میں رکاوٹ ہوں اور ایسے تلمیح و اشارات جو قاری کو مقصدیت تک نہ پہنچنے دے اور حجاب بن جائے، اسے پسند نہیں کرتے، انہیں شعراء ونقادان فن کے اس اصول سے بھی اختلاف ہے کہ "راست انداز بیان شعر میں محمود نہیں" اس کے برعکس وہ سادہ اشعار کی پرکاری اور تاثیر کے قائل ہیں، فرماتے ہیں۔

سادہ اشعار بھی پرکار ہوا کرتے ہیں
سادہ شعروں میں بھی تاثیر ہوا کرتی ہے
سادہ الفاظ بنالیتے ہیں قیدی اپنا
سادہ لفظوں میں زنجیر ہوا کرتی ہے

ان کا خیال تھا کہ۔

ہو اگر شاعر کے دل میں اپنے مقصد کی لگن
شعر کو سانچے میں خود ہی ڈھالتے ہیں فکر وفن

اور یہ کہ:

میں نہ ابہام کا قائل ہوں نہ ایہام پسند
نہ مجھے وعظ کی بھپتی پہ حیا آتی ہے
ہے میری راست بیانی میرے مقصد کی امین

## آئینہ اپنے مخاطب کو دکھا آتی ہے

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا عروج قادری شاعری میں کسی کے مقلد نہیں، تلمیذ الرحمٰن نظر آتے ہیں، ان کا اپنا ایک رنگ و آہنگ ہے، جس میں مقصدیت کی جلوہ گری اور ان کے ایمان کا نور چمکتا ہے، ان میں ایک خاص قسم کی تاثیر ہے جو دل و دماغ پر اثر کرتی ہے، اور دیرپا اثر چھوڑتی ہے، ایسا اس لئے ممکن ہوا کہ خود ان کا دل نور ازل سے منور ہے، ان کے نزدیک بے نور رہنے کی کوئی وقعت نہیں اور جو کاسہ سر سنگ جنوں سے چور نہ ہو، وہ بے قیمت ہے، فرماتے ہیں:

اس سینے کی وقعت ہی کیا جس سینے میں تیرا نور نہیں
اس کاسۂ سر کی کیا قیمت جو سنگ جنوں سے چور نہیں
ہم پروہ عروج خستہ جگر تلوار اُٹھاتے ہیں لیکن
اس وار سے تسکیں کیا ہوگی جو وار ابھی بھر پور نہیں

مختصر یہ کہ آج کے اس دور میں جب کہ ہر طرف اسلام دشمنی، خدا بیزاری کا غلبہ ہے، ابہام و تشکیک سے فضا معمور ہے، نا آسودگی اور بیزاری نے ہر گھر میں اپنا مسکن بنالیا ہے، فکر و نظر کی وحدت قصہ پارینہ بن کر رہ گئی ہے، قنوطیت اور فراریت نے دل و دماغ کو معطل کر رکھا ہے، ایسے میں مولانا عروج قادری کی نظمیں ہمیں فکر و عمل پر ابھارتی ہیں اور یاس و قنوطیت سے دور رکھتی ہیں، اس طرح ان کی شاعری سدا بہار گلشن ہے جو ہر دور میں اپنے بلند تخیل اور جمالیاتی رچاؤ فکر و فن سے ہم آہنگی معنوی گہرائی اور مقصدی شعور کے ساتھ قاری کے لئے نشاط جسم نہیں، غذائے روح کا کام کرتی رہے گی، ان کا یہ پیغام بھی ہم سب کو یاد رکھنا چاہئے۔

کامیابی تو کام سے ہوگی
نہ کہ سودائے خام سے ہوگی
بات ہوگی دلیل سے ثابت
نہ کہ زور کلام سے ہوگی
راہ ہموار غلبہ دین کی
دعوت خاص و عام سے ہوگی
مطمئن روح عصر حاضر کی
دین حق کے نظام سے ہوگی
باریابی عروج ان کے یہاں
نالہ صبح و شام سے ہوگی